جلد ٦

اصلاحی مجالس

- ماضی کا گناہ یاد آنے پر دوبارہ استغفار
- عبادات میں ذوق وشوق مطلوب نہیں
- اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے اسباب
- کثرت ذکر اللہ محبت پیدا کرنے کا ذریعہ
- ادعیہ مأثورہ۔ کثرت ذکر اللہ کا بہترین طریقہ
- اللہ کی نعمتوں کا مراقبہ کریں
- حقوق العباد سے توبہ کا طریقہ
- اعمال کے دنیاوی ثمرات
- اللہ سے اللہ کی محبت مانگی
- محبت طبعی یا عقلی
- ہر چیز اللہ کی عطا ہے
- خوف اور رجا
- مخلوق کا ڈر
- اللہ کی محبت

اصلاحی مجالس

٦

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

خطاب	حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم
ضبط وترتیب	محمد عبداللہ میمن صاحب
تاریخ اشاعت	جنوری ۲۰۰۶ء
مقام	جامع مسجد دارالعلوم کراچی
باہتمام	ولی اللہ میمن صاحب
ناشر	میمن اسلامک پبلشرز
کمپوزنگ	خلیل اللہ فراز (cell:0321-2606274)
قیمت	=/ روپے

ملنے کے پتے

- میمن اسلامک پبلشرز، ۱/۱۸۸، لیاقت آباد کراچی ۱۹
- دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی
- مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴
- کتب خانہ مظہری، گلشن اقبال، کراچی
- اقبال بک سینٹر، صدر، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ۔ اَمَّا بَعْدُ!

اللہ جل شانہ کے فضل وکرم سے ''اصلاحی مجالس'' کی جلد ششم آپ کے ہاتھ میں ہے، یہ جلد ''انفاس عیسیٰ'' کے باب دوم تحقیقات کے عنوان ''توبہ'' کے بعض ملفوظات اور عنوان ''عشق وتعلق مع اللہ'' کے مکمل ملفوظات اور عنوان ''خوف ورجا'' کے بعض ملفوظات کی تشریح پر مشتمل ہے، اللہ تعالیٰ استاذ مکرم حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی عمر میں برکت عطا فرمائے، اور انفاس عیسیٰ کی تشریح کی تکمیل فرمادے، اور احقر مرتب اور ناشر کو صدق واخلاص کے ساتھ کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس کام کو مزید آگے بڑھانے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

محمد عبداللہ میمن

۱۸، ذی الحجہ ۱۴۲۶ھ

اجمالی فہرست مجالس

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ نمبر

مجلس نمبر ۸۱

ماضی کا گناہ یاد آنے پر دوبارہ استغفار

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر
ذاکر کون؟ ذکر کا وسیع مفہوم	۱۰۱
زمانہ ماضی پر استغفار کرو	۱۰۲
زمانہ حال پر شکر یا صبر	۱۰۳
دل ہی دل میں شکر	۱۰۴
''شکر'' عظیم عبادت	۱۰۵
ناشکری کے کلمات مت نکالو	۱۰۵
شکر کی عادت ڈالو اور نعمتوں کا دھیان کرو	۱۰۶
تکلیف شاذ و نادر ہی آتی ہے	۱۰۷
''شکر'' صبر پر غالب رہنا چاہئے	۱۰۷
''تعلق مع اللہ'' حاصل ہو رہا ہے	۱۰۸
وہ تو دل میں ہی مل گئے	۱۰۸
مستقبل کے بارے میں پناہ مانگو	۱۰۹
وہ بندہ ذاکرین میں سے ہے	۱۱۰
نعمتوں کو سوچا کرو	۱۱۰

مجلس نمبر ۸۵

ادعیہ ماثورہ کثرتِ ذکر اللہ کا بہترین طریقہ	۱۱۳
تمہید	۱۱۳

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

صفحہ نمبر	عنوان

عنوان	صفحہ نمبر

مجلس نمبر ۸۷

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر
ہر کام میں حضور کی اتباع	۱۷۸
کوئی "سنت" چھوٹی نہیں	۱۷۹
اس وقت تم اللہ کے محبوب بن رہے ہو	۱۷۹
وہ سنتیں جن میں کوئی مشقت نہیں	۱۸۰
سنتوں کی ڈائری	۱۸۱
جب تک بازار میں "لوکی" ملے ضرور لاؤ	۱۸۱
تین دن تک زندگی کا جائزہ	۱۸۲
یہ طعنے گلے کا ہار ہیں	۱۸۳
قیامت کے روز ایمان والے ان پر ہنسیں گے	۱۸۴
مجلس نمبر ۸۸	
اللہ سے اللہ کی محبت مانگیے	۱۸۷
محبت حاصل کرنے کا پانچواں سبب	۱۸۷
اللہ کی محبت ان تین چیزوں سے زیادہ	۱۸۸
ٹھنڈا پانی بہت مرغوب تھا	۱۸۸
جھولی اور پیالہ بھی انہی سے مانگو	۱۸۹
مانگنے کا طریقہ بھی انہی سے مانگو	۱۹۰
اچھی دعا مانگنے کی توفیق انہی سے مانگو	۱۹۰

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

مجلس نمبر۹۲

عنوان	صفحہ نمبر
خوف اور رجا	۲۷۳

مجلس نمبر ۹۳

عنوان	صفحہ نمبر
مخلوق کا ڈر خالق کے ڈر سے زیادہ	۲۸۹

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

ماضی کا گناہ یاد آنے پر دوبارہ استغفار

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱/۱۸۸، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک
اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶
مجلس نمبر : ۸۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ط

ماضی کا گناہ یاد آنے

پر دوبارہ استغفار

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ۔ مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَأَشْھَدُاَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا ۔ أَمَّا بَعْدُ!

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''توبۃ النصوح کے بعد اگر از خود پُرانا گناہ یاد آ جائے تو تجدید توبہ کر کے پھر کام میں لگ جائے، اس سے زیادہ کاوش کرنا غلو ہے اور یہ قصد کرنا کہ ذرا بھی کوتاہی نہ ہونے پائے، یہ ایک قسم کا دعویٰ اور غلو ہے، گو عقلاً محال نہیں لیکن عادۃً محال ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے: سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاسْتَقِیْمُوْا وَلَنْ تُحْصُوْا

(انفاس عیسیٰ، ص ۱۹۷)

گناہ یاد آنے پر دوبارہ استغفار کرلو

اس ملفوظ میں حضرت والا نے دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں، ایک بات تو وہ ہے جو تقریباً ہر آدمی کو پیش آتی ہے کہ ایک مرتبہ گناہ سے توبہ کرنے کی توفیق ہوگئی اور توبہ بھی ''توبۃ النصوح'' یعنی مکمل توبہ کرلی، اب توبہ کرنے کے بعد وہ گناہ جس سے توبہ کی تھی، وہ بار بار یاد آتا رہتا ہے اور بار بار ذہن میں اس کا تصور آتا رہتا ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا کہ اپنی طرف سے قصد کر کے اور جان بوجھ کر گناہ کو یاد کرنا تو غلط بات ہے، لہٰذا قصداً تو اس گناہ کو یاد نہ کرے اور نہ توبہ کرنے کی غرض سے یاد کرے، کیونکہ ایک مرتبہ اس گناہ سے توبہ کر چکا، اور اگر اس وجہ سے گناہ کو یاد کر رہا ہے کہ اس گناہ کو کرتے وقت نفس کو بڑی لذت حاصل ہوئی تھی، اس وجہ سے گناہ کو یاد کرنا بہت زیادہ خطرناک ہے، لیکن اگر غیر اختیاری طور پر اس گناہ کا خیال آ جائے تو اس موقع پر پھر استغفار اور توبہ کی تجدید کرلے اور یہ کہے:

”اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ اِلَیْهِ
اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ اِلَیْكَ“

توبہ کرنے کی ایک وجہ

اب سوال یہ ہے کہ دوبارہ توبہ کی تجدید کیوں کر رہا ہے؟ دوبارہ استغفار کیوں کر رہا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اس وجہ سے توبہ کی تجدید کر رہا ہے کہ اس نے سوچا کہ میرے دل میں دوبارہ اس گناہ کا جو تصور اور خیال آ رہا ہے، کہیں اس کے آنے میں میرے اختیار کو کوئی دخل نہ ہو، کیونکہ اگر وہ تصور بے اختیار آ رہا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی مواخذہ نہیں۔ لیکن اگر اس گناہ کے تصور کے آنے میں کچھ اختیار کو بھی دخل ہو تو وہ قابل مواخذہ ہے، اس وجہ سے دوبارہ استغفار اور توبہ کی تجدید کر رہا ہے۔ اس وجہ سے دوبارہ توبہ نہیں کر رہا ہے کہ سابق توبہ کے قبول ہونے کا یقین نہیں ہے، کیونکہ آدمی جب توبہ اور استغفار کرے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہی امید رکھنی چاہئے کہ انشاء اللہ میری توبہ قبول ہو گئی اور اس شک وشبہ کا شکار نہ ہو۔

توبہ کرنے کی دوسری وجہ

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس گناہ کے خیال اور تصور کا بار بار دل میں آنا، یہ کہیں دوبارہ مجھے گناہ کے اندر مبتلا نہ کر دے، اس وجہ سے بھی دوبارہ استغفار اور توبہ کی تجدید کر رہا ہے، کیونکہ استغفار اور توبہ کر لینے سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انشاء اللہ حفاظت رہے گی۔

گناہ ایک بڑی مصیبت ہے

جیسے بزرگ فرماتے ہیں کہ جب مصیبت آئی تھی، اس وقت تو "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" پڑھ لیا تھا لیکن بعد میں جب کبھی وہ مصیبت دوبارہ یاد آئے تو اس وقت پھر "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" کہہ لو۔ اسی طرح گناہ بھی ایک مصیبت ہے اور یہ دنیاوی مصیبتوں سے زیادہ بڑی مصیبت ہے، اسی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی:

اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ مُصِيْبَتَنَا فِيْ دِيْنِنَا

یعنی اے اللہ! ہماری مصیبت ہمارے دین میں نہ آئے۔ اگر وہ مصیبت ہماری دنیا پر گزر جائے تو اتنی بڑی مصیبت نہیں، اگرچہ ہم آپ سے اس کی بھی عافیت مانگتے ہیں، لیکن دین پر مصیبت نہ آئے اور گناہ اور معصیت کا ارتکاب دین پر مصیبت ہیں۔ لہٰذا جس طرح مصیبت کے یاد آنے پر "إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" پڑھنے کا حکم ہے، اسی طرح جب گناہ یاد آئے تو دوبارہ توبہ و استغفار کر لو اور کہو:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ"

گناہ یاد آنے پر پناہ مانگو

ہمارے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ استغفار کے ساتھ ساتھ اس گناہ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ بھی مانگو اور کہو کہ یا اللہ! مجھے یہ گناہ کا خیال آ رہا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مجھے پھر پھسلا دے اور گناہ کے اندر مبتلا کر دے، یا اللہ! میں آپ

کی پناہ مانگتا ہوں اور یہ کہو:

اَللّٰھُمَّ اِنّی اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ

اے اللہ! میں اپنے نفس کے شر سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسی کیسی دعائیں تلقین فرمادیں کہ دنیا و آخرت کی حاجتوں کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگا نہ ہو۔ ایک دعا میں آپ نے فرمایا:

اَللّٰھُمَّ اِنّی اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ الشَّیْطٰنِ وَشِرْکِہٖ

اے اللہ! شیطان کے شر سے اور اس کے شرک سے پناہ مانگتا ہوں۔ لہٰذا جب بھی کسی گزشتہ گناہ کا خیال آئے تو اس وقت دوبارہ استغفار کرلو اور پھر ان دعاؤں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگ لو۔

توبہ پر قائم رہنے کیلئے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو

بندے کا کام یہ ہے کہ اپنی طرف سے قدم بڑھائے اور جتنا اس کے بس میں ہے اتنا کر گزرے، پھر آگے اللہ تعالیٰ کے حوالے کر کے ان سے مدد مانگ لے اور کہے کہ یا اللہ! میرے بس میں اتنا ہی تھا، اب آگے اس کی تکمیل اور اس پر ثابت قدم رکھنا آپ کے قبضۂ قدرت میں ہے، آپ ہی مجھے اس کی طاقت عطا فرما دیجئے، میں نے تو اپنی طرف سے توبہ کرلی، لیکن اے اللہ! اس توبہ کی تکمیل اور اس توبہ پر قائم رکھنا آپ کی قدرت میں ہے، اپنی رحمت سے مجھے اس پر قائم رکھئے، یہ دو کام کرلو تو بس پھر تم کامیاب ہو۔

دوبارہ توبہ کر کے کام میں لگ جاؤ

اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ ''تجدید توبہ کر کے پھر کام میں لگ جائے، اس سے زیادہ کاوش کرنا غلو ہے''۔ یعنی گناہ کا خیال آنے پر ''استغفر اللہ'' پڑھ کر اپنے کام میں لگ جائے، اس کے بعد یہ کاوش کرنا کہ یہ خیال مجھے کیوں آیا؟ یہ خیال بار بار کیوں آ رہا ہے؟ کہیں میں خبیث تو نہیں ہوگیا ہوں، یا شاید میرے اوپر شیطان کا ایسا داؤ چلا ہوا ہے کہ میں اس کے آگے مغلوب ہوگیا ہوں اور اب میری اصلاح کی کوئی توقع باقی نہیں رہی۔ اس قسم کے خیالات دل میں لانا غلو ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ توبہ کرلو، ہم نے توبہ کرلی، اور جو غیر اختیاری خیالات آ رہے تھے، ان سے بھی توبہ کرلی، اب خواہ مخواہ اس گناہ کو وظیفہ مت بناؤ بلکہ اپنے کام میں لگو، اس سے زیادہ کاوش کرنا غلو ہے۔ حدیث شریف میں فرمایا کہ:

اَجْمِلُوْا فِیْ الطَّلَبِ وَتَوَکَّلُوْا عَلَیْہِ

یعنی اپنے کرنے کا کام اجمالی طور پر کرلو اور پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو۔

کمال کے حصول کی فکر مت کرو

اس ملفوظ میں حضرت والا نے دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ ''یہ قصد کرنا کہ ذرا بھی کوتاہی نہ ہونے پائے، یہ بھی ایک قسم کا دعویٰ اور غلو ہے۔'' یعنی یہ سمجھنا کہ میں ایسا کامل اور مکمل بن جاؤں کہ ذرا سی بھی اونچ نیچ نہ ہو، ذرا سی بھی کہیں کسر نہ ہو، عبادت ہو تو وہ کامل اور مکمل ہو، اخلاق بھی کامل اور مکمل ہوں،

دین کے ہر معیار پر سو فیصد پورا اتروں۔ یہ فکر بھی اس بات کا دعویٰ ہے کہ میں بڑا اونچا آدمی ہوں کہ اس درجے کے کمال کا طالب ہوں، یہ بھی ایک قسم کا دعویٰ ہے۔ ارے بھائی! سیدھے سادے طریقے سے کام کرو، سو فیصد کمال کی فکر چھوڑو، اس لئے کہ یہ درجہ حاصل ہونا گو عقلاً محال نہیں لیکن عادۃً محال ہے، کیونکہ عقلاً یہ محال نہیں کہ کوئی آدمی پیغمبر جیسا عمل کرنے لگے یا وہ صحابی جیسا عمل کرنے لگے، یہ بات عقلاً محال نہیں لیکن عادۃً محال ہے، اس لئے کہ عادۃً ایسا ہوتا نہیں کہ اس جیسا کمال حاصل ہو جائے۔

سیدھے ہونے کے قریب ہو جاؤ

پھر اس کی دلیل میں یہ حدیث پیش کی کہ حدیث شریف میں فرمایا کہ:

سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاسْتَقِيْمُوْا وَلَنْ تُحْصُوْا

(بخاری شریف)

اس حدیث میں سب سے پہلے فرمایا: "سَدِّدُوْا" سیدھے ہو جاؤ، یعنی دین کے تمام تقاضوں پر پورے اترو، تب جا کر سیدھے ہو گے ورنہ سیدھے نہیں ہو گے۔ لیکن ساتھ دوسرا لفظ ارشاد فرمایا "وَقَارِبُوْا" یعنی پورا سیدھا ہونا تو بڑا مشکل ہے، لہٰذا قریب آ جاؤ۔ پھر ارشاد فرمایا: "وَاسْتَقِيْمُوْا" یعنی دوبارہ فرمایا کہ سیدھے ہو جاؤ، لیکن یہ بھی فرمایا کہ "وَلَنْ تُحْصُوْا" یعنی پورا سیدھا ہونا تو کبھی نہیں کر سکو گے بلکہ کچھ نہ کچھ کسر رہے گی، لہٰذا جب کسر رہ جائے تو اس پر استغفار کرتے رہو اور توبہ کرتے رہو۔

عبادات کوتاہیوں سے بھری ہوئی ہیں

اللہ تعالیٰ نے نماز پڑھنے، روزہ رکھنے، اعتکاف کرنے، قرآن کریم کی تلاوت کرنے، ذکر کرنے اور تسبیح کرنے کی توفیق عطا فرما دی، لیکن ان عبادتوں میں سے جس عبادت کو بھی دیکھو، وہ کوتاہیوں سے بھری ہوئی نظر آئے گی، کیا ہم نے نماز اسی طرح پڑھی جیسے پڑھنی چاہئے تھی؟ کیا نماز میں جیسا خشوع ہونا چاہئے تھا، ویسا خشوع حاصل ہوا؟ جیسا دھیان نماز میں ہونا چاہئے تھا، ویسا دھیان حاصل ہوا؟ نماز میں اعضاء اور جوارح کو جیسا خضوع حاصل ہونا چاہئے تھا، ویسا خضوع حاصل ہوا؟ جب نہیں ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری نماز کوتاہیوں سے بھری ہوئی ہے۔ یا روزہ تو رکھ لیا لیکن جیسا روزہ رکھنا چاہئے ویسا روزہ رکھا؟ جس کمال کا روزہ ہونا چاہئے وہ ہوا؟ جب تلاوت کی تو کیا تلاوت کا حق ادا ہوا؟ حروف کی جیسی ادائیگی ہونی چاہئے تھی، ویسی ادائیگی ہوئی؟ الفاظ کی طرف جیسا دھیان ہونا چاہئے تھا، ویسا دھیان ہوا؟ معانی کی طرف جیسا دھیان ہونا چاہئے تھا، ویسا دھیان ہوا؟ جب نہیں ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری عبادات کوتاہیوں سے بھری ہوئی ہیں۔

کوتاہیوں کی وجہ سے مایوس مت ہو جاؤ

اب ایک راستہ تو یہ ہے کہ مایوس ہو کر بیٹھ جاؤ کہ عبادت کا حق ادا کرنا ہمارے بس کا کام نہیں، نہ ہماری نماز اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش کرنے کے قابل ہے اور نہ روزہ اور نہ تلاوت پیش کرنے کے قابل ہے۔ لیکن حضور صلی

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مایوس ہو کر مت بیٹھ جاؤ، کیونکہ تم مکمل سیدھے نہیں ہوسکو گے، اس لئے جتنا ہو سکے قریب آ جاؤ۔

عربی زبان کی وسعت

یہ عربی زبان بھی بڑی عجیب و غریب زبان ہے، اس میں ذرا سے فرق سے معانی تبدیل ہو جاتے ہیں، چنانچہ اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ "قَارِبُوْا" فرمایا جو باب مفاعلہ سے امر کا صیغہ ہے۔ "اُقْرُبُوْا" نہیں فرمایا، اسی طرح "اِقْتَرِبُوْا" نہیں فرمایا۔ دیکھئے: ایک ہوتا ہے "قَرُبَ۔ یَقْرُبُ" جو باب کرم سے ہوتا ہے اور ایک ہوتا ہے "اِقْتَرَبَ یَقْتَرِبُ" جو باب افتعال سے ہوتا ہے، ان کے معنی ہیں، مطلق قریب آنا۔ اور ایک ہے باب مفاعلہ سے "قَارِبُوْا" اس کے معنی میں تدریج کی خاصیت پائی جاتی ہے، لہٰذا ایک مرتبہ قریب آ جانے کو "قَارِبُوْا" نہیں کہتے بلکہ اس کے معنی ہیں قریب آ جانے کی کوشش کرتے رہنا اور تھوڑا تھوڑا کر کے قرب آنا، مثلاً آج ایک قدم بڑھایا، کل کو دوسرا قدم بڑھایا، پرسوں تیسرا قدم بڑھایا، یہ پورا عمل "مقاربت" کہلاتا ہے۔

زندگی بھر قریب آنے کی کوشش کرتے رہو

لہٰذا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قَارِبُوْا" یعنی تدریجاً قریب آنے کی کوشش شروع کر دو اور قدم بڑھانا شروع کر دو یہاں تک کہ ہمارے قریب پہنچ جاؤ۔ اس لفظ میں درحقیقت ایک اشکال کا جواب ہے، وہ

اشکال یہ ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ ہم چاہے جتنی کوشش کرلیں پھر بھی سیدھے نہیں ہو سکتے اور جب سیدھے نہیں ہو سکتے تو پھر سیدھا ہونے کی فکر ہی چھوڑ دیں۔ اس کا جواب اس لفظ سے دیدیا کہ ساری عمر قریب آنے کی کوشش کرتے رہو اور سیدھے ہونے کی کوشش کرتے رہو، پورے سیدھے تو نہیں ہوسکو گے لیکن قریب آ جاؤ گے، لہٰذا اس کوشش کو مت چھوڑنا، تم سے مطالبہ کوشش کرنے کا ہے، تم سے نتیجہ کا مطالبہ نہیں کہ نتیجہ حاصل ہوا یا نہیں؟ کوشش کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاؤ۔

ساری عمر تراش خراش کرنی ہے

اس بات کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

اندریں راہ می تراش و می خراش
تادم آخر دمے فارغ مباش

یعنی اس راستے میں تو ساری عمر تراش خراش کرنی ہی ہے، ہر وقت دھیان اور فکر لگی رہے کہ کہاں غلطی ہو رہی ہے اور پھر ان غلطیوں کو درست کرتا رہے، آخری دم تک ایک لمحہ کے لئے بھی فارغ ہو کر نہیں بیٹھنا، لہٰذا کوئی یہ نہ سوچے کہ جب بالکل سیدھے نہیں ہو سکتے تو بس جیسے زندگی گزر رہی ہے، گزرنے دو، زیادہ اصلاح کی فکر ہی فضول ہے۔ اس حدیث میں اس سوچ کی تردید فرما دی کہ یہ جو کہا جا رہا ہے کہ مکمل سیدھے نہیں ہو سکتے، وہ نتیجے کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ نتیجے میں مکمل سو فیصد سیدھے نہیں ہو سکتے لیکن اس کے باوجود کوشش

میں کمی نہیں آنی چاہئے۔

منزل مقصود نہیں کوشش کرنا مقصود ہے

کیونکہ اس راستے میں منزل مقصود نہیں بلکہ کوشش بذات خود مقصود ہے، لگا رہنا مقصود ہے، یہی منزل ہے، لہٰذا نتائج کی پرواہ نہیں کرو بلکہ کوشش میں لگے رہو۔ میں بھی کبھی شعر کہہ دیتا تھا، ایک شعر کہا تھا جو حضرت والا کو بہت پسند تھا، اس میں یہی مضمون ہے:

قدم ہیں راہِ اُلفت میں تو منزل کی ہوس کیسی
یہاں تو عین منزل ہے تھکن سے چور ہو جانا

یہاں تو مقصود ہی یہ ہے کہ آدمی چلتا رہے اور چلتے چلتے تھکن سے چور ہو جائے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا:

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ (سورۃ الم نشرح)

اس آیت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جا رہا ہے کہ جب آپ دوسرے کاموں سے فارغ ہو جائیں تو عبادت کے اندر اپنے آپ کو تھکائیں۔ بہر حال! نتائج حاصل کرنا نہ تمہارے بس کا کام ہے اور نہ ہی تمہارے سوچنے کی چیز ہے بلکہ تمہارا کام یہ ہے کہ منزل کی طرف چلتے رہو، یہ چلنا بذات خود مقصود ہے۔

قدم بڑھاتے چلے جاؤ

لہٰذا فکر نہیں چھوڑنی بلکہ فکر بھی جاری رکھو، کوشش بھی جاری رکھو، البتہ

نتائج سے بے نیاز ہو جاؤ۔ جو طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتادیا اور آپ کے وارثوں نے بتادیا، اس طریقہ پر قدم رکھ کر چلتے جاؤ، منزل پر کب پہنچو گے اور کہاں پہنچو گے؟ اس کی فکر چھوڑ دو۔

بر صراطِ مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

جب "صراطِ مستقیم" پر قدم رکھ دیا تو اب انشاء اللہ گمراہ نہیں ہو گے۔ لہٰذا جو کام ہو اس کو سنت کے مطابق کرتے جاؤ۔

نماز کی توفیق پر شکرادا کرو

یہ جو دلوں میں خیالات آتے ہیں کہ میری نماز صحیح نہیں ہے، میرا روزہ صحیح نہیں ہے، یہ سب خیالات اس حد تک تو مفید ہیں کہ ان خیالات کے نتیجے میں تم اپنی نماز کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کرو، لیکن ان خیالات کی وجہ سے ان عبادات کی ناقدری مت کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان عبادات کو ادا کرنے کی جو توفیق عطا فرمائی ہے، یہ بھی ان کا کرم ہے، اگر یہ توفیق نہ ملتی تو تم کیا کر لیتے؟ لہٰذا اس توفیق ملنے پر اللہ تعالیٰ کا شکرادا کرو اور کہو کہ اے اللہ! آپ نے اپنے فضل وکرم سے اس عبادت کو انجام دینے کی توفیق عطا فرمادی۔ اے اللہ! آپ کا مجھ پر بڑا شکر اور احسان ہے۔ قرآن کریم کی یہ جو آیت ہے اس کے بھی یہی معنی ہیں:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ۔ (سورۃ الاعراف: آیت ۴۳)

یعنی تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے اس کی ہدایت اور رہنمائی فرمائی، اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت نہ ملتی تو ہم ہدایت پانے والے نہیں تھے۔ لہٰذا ان نیک اعمال کی توفیق ملنے پر شکر ادا کرو۔

نماز کی کوتاہیوں پر استغفار کرلو

البتہ ہماری عبادات میں، نماز میں، روزے میں بیشک کوتاہیاں بھی ہیں، ان کوتاہیوں کا علاج استغفار ہے۔ لہٰذا جب ان کوتاہیوں پر استغفار کرلو گے تو اس کے نتیجے میں کوتاہیاں مٹ جائیں گی اور صرف عبادت اور نیکی ہی نیکی باقی رہ جائے گی، کیونکہ استغفار نے اس عبادت پر پالش کردی اور اس عبادت پر کوتاہیوں کی جو گندگی لگ گئی تھی، استغفار نے اس کو صاف کردیا۔ قرآن کریم میں نیک بندوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

كَانُوْا قَلِيْلاً مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَ
بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ (سورۃ الذاریات: ۱۷۔۱۸)

یعنی رات کو بہت کم سوتے تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں کھڑے ہوکر عبادت کرتے تھے اور پھر سحری کے وقت استغفار کرتے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا رات کو کوئی گناہ کیا تھا جس سے وہ استغفار کرتے تھے، نہیں، تو پھر وہ استغفار کیوں کرتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اس بات پر استغفار کرتے تھے کہ اے اللہ! رات کے وقت ہم نے عبادت تو کرلی لیکن وہ عبادت آپ کی شایانِ شان نہ ہوئی اور اس عبادت میں بیشمار کوتاہیاں ہوگئیں، بے شمار

غلطیاں ہوگئیں، اے اللہ! ان کوتاہیوں اور غلطیوں کی طرف سے آپ کے حضور استغفار کرتے ہیں۔ اس استغفار کا نتیجہ یہ ہوا کہ رات بھر جو عبادت کی تھی، اس عبادت میں جو مختلف کوتاہیاں اور خرابیاں ہوگئی تھیں اور ان کوتاہیوں کی وجہ سے اس عبادت پر جو میل کچیل آ گیا تھا، آخر میں استغفار کرکے اس میل کچیل کو دور کر دیا اور اس کی فنیشنگ کر دی اور پالش کر دی، اب وہ عمل اس قابل ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں انشاء اللہ قبول ہوگا۔ لہٰذا ہر عمل کے بعد اس عمل کی توفیق ملنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور اس عمل میں کوتاہی ہو جانے پر استغفار کرو، جب یہ دو کام کرلو گے تو انشاء اللہ تعالیٰ وہ عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہو جائے گا۔

عبادت کی توفیق قبولیت کی علامت ہے

ہمارے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ بعض لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ معلوم نہیں ہماری نماز قبول بھی ہے یا نہیں؟ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ دل میں یہ کھٹکا رہنا چاہئے اور ڈر رہنا چاہئے، اس لئے کہ ایک مؤمن کا کام یہ ہے کہ کرتا رہے اور ڈرتا رہے، لیکن ہمارے بزرگوں نے یہ فرمایا کہ جب ایک عمل کرنے کے بعد اسی عمل کو دوبارہ کرنے کی توفیق مل جائے تو سمجھ لو کہ پہلا عمل اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا، اگر پہلا عمل قبول نہ ہوتا تو دوسری بار اس عمل کی توفیق نہ ملتی، مثلاً ایک نماز ادا کی اور اس کے بعد دوبارہ نماز پڑھنے کی توفیق مل گئی تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ پہلی نماز اللہ تعالیٰ کے

یہاں قبول ہوگئی۔ یا ایک روزہ رکھنے کے بعد دوسرا روزہ رکھنے کی توفیق ہوگئی تو یہ پہلے روزے کی قبولیت کی علامت ہے، لیکن ہر عمل کے بعد اس کے عدم قبولیت سے ڈرو اور ہر عمل کے بعد یہ کہو: الحمدللہ، استغفراللہ، اس کے نتیجے میں مزید عبادت کی توفیق مل جائے گی۔ بس ساری عمر یہ کرنا ہے کہ اپنی سی کوشش کیے جاؤ، کوشش میں کمی نہ کرو اور جو کوتاہیاں ہوں ان پر استغفار کیے جاؤ، انشاء اللہ منزل تک پہنچ جاؤ گے۔

آگے ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

> جب تک صاحبِ عمل کو اس سے اندیشہ ہوتا رہے کہ مبادا کہیں نفس کا شائبہ نہ ہوگیا ہو، حفاظت خداوندی اس کی رفیق رہتی ہے لیکن تدارک بالاستغفار کرتے رہنا چاہئے۔ (انفاس عیسیٰ، ص ۱۹۸)

دین دونوں کے درمیان ہے

وہی بات بیان فرمارہے ہیں جو میں نے ابھی عرض کی کہ یہ راستہ بھی عجیب وغریب قسم کا ہے کہ بظاہر اس میں بعض باتیں متضاد معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں متضاد نہیں ہیں۔ چنانچہ ایک طرف یہ حکم ہے کہ عمل کرتے رہو اور عمل سے مایوس نہ ہو بلکہ عمل پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ ان کی توفیق سے یہ عمل میں نے انجام دیدیا اور اس عمل کی تحقیر مت کرو کہ یہ عمل کیا ہے یہ تو ٹکریں مارنا ہے وغیرہ۔ دوسری طرف یہ بھی حکم ہے کہ اس عمل پر عجب بھی نہ ہو اور عمل کے بعد دماغ میں یہ گھمنڈ نہ ہو کہ ہم نے تو بڑا کام کرلیا اور اس کے نتیجے میں عجب

کے اندر مبتلا ہو کر اپنے آپ کو اللہ والا سمجھنے لگے وغیرہ۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کو ان دونوں باتوں کے درمیان رہنا چاہئے۔

عمل کے بعد ڈرتے رہو

لہٰذا ایک طرف عمل بھی کرو اور دوسری طرف دل میں یہ اندیشہ بھی رہے کہ میرے کسی نفسانی شائبہ سے کہیں یہ عمل خراب نہ ہو گیا ہو۔ اسی بات کو ہمارے بزرگوں نے دو لفظوں میں بیان فرما دیا کہ عمل کرتا رہے اور ڈرتا رہے، جب تک یہ فکر اور اندیشہ رہے گا، اس وقت تک حفاظت خداوندی اس کی رفیق رہے گی، اور ساتھ میں اس اندیشے کا تدارک بالاستغفار کرتے رہنا چاہئے کہ اے اللہ! میں نے یہ عمل تو کر لیا لیکن مجھے یہ اندیشہ ہے کہ میرے کسی نفسانی شائبہ سے کہیں یہ عمل خراب نہ ہو گیا ہو، اے اللہ! اس نفسانی شائبہ سے استغفار کرتا ہوں۔ لہٰذا نہ تو اس عمل سے مایوس ہو اور نہ گھمنڈ میں مبتلا ہو، دونوں باتیں غلط ہیں۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی عجیب بات ارشاد فرمائی جو یاد رکھنے کے قابل ہے، فرمایا کہ جو شخص عمل کر کے یہ سمجھ رہا ہے کہ اس کا یہ عمل اس کو جنّت میں لے جائے گا تو وہ فضول محنت کر رہا ہے، اور جو شخص عمل کئے بغیر یہ سمجھ رہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے جنّت میں چلا جائے گا تو وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ

انسان عمل تو کرے لیکن اس عمل پر بھروسہ نہ ہو بلکہ بھروسہ اللہ تعالیٰ کی رحمت پر ہو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو کھینچنے اور دعوت دینے والا یہی عمل ہے، لہٰذا اس عمل کو تو بیکار نہ سمجھے بلکہ عمل کرے، لیکن ساتھ ساتھ اس عمل پر یہ بھروسہ نہ ہو کہ یہ عمل اس کو جنّت میں لے جائے گا جب تک اللہ تعالیٰ کی رحمت شامل حال نہ ہو۔

کوئی عبادت اللہ تعالیٰ کے شایان شان نہیں

اس لئے کہ تم وہ عمل چاہے کتنا ہی اچھے سے اچھا کرلو لیکن پھر بھی وہ عمل اللہ تعالیٰ کی شایانِ شان نہیں ہوسکتا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ماعبدناك حق عبادتك ماعرفناك حق معرفتك

ہم تیری عبادت نہ کر سکے کہ تیری عبادت کا حق ہے اور
ہم تجھے نہ پہچان سکے جیسا کہ تجھے پہچانے کا حق ہے۔

لہٰذا کسی عمل میں بذات خود یہ صلاحیت نہیں کہ وہ انسان کو جنّت کا مستحق بنا دے، کیونکہ جو تم نے عمل کیا ہے، کیا وہ عمل اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش کرنے کے لائق ہے؟ چاہے وہ عمل کتنا ہی بنا سنوار کر کرلو، سو فیصد خشوع خضوع کے ساتھ کرلو، پھر بھی وہ عمل اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش کرنے کے لائق نہیں۔

عبادت کی توفیق اور اعضاء کس نے دیے؟

کیونکہ یہ دیکھو کہ اس عمل کے کرنے کی توفیق کس نے دی؟ جس ہاتھ

پاؤں کے ذریعہ تم نے وہ عمل کیا، وہ ہاتھ پاؤں کس نے دیے؟ وہ اعضاء و جوارح کس نے دیے؟ اگر تم نے ذکر کا عمل کیا تو جس زبان کے ذریعہ تم نے ذکر کیا وہ زبان کس نے عطا فرمائی؟ اس زبان میں گویائی کس نے بخشی؟ یہ سب تو انہیں کا دیا ہوا ہے، پھر کیا ان کی بارگاہ میں پیش کر رہے ہو؟ بلکہ ان ہی کی دی ہوئی چیز ان کی بارگاہ میں پیش کر رہے ہو۔

ایک دیہاتی کا واقعہ

ہمارے اعمال کی مثال تو دیہاتی کے پانی کے مٹکے کی طرح ہے کہ ایک دیہاتی نے بادشاہ سے ملاقات کرنے کا ارادہ کیا، اس نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا کہ بادشاہ کے لئے کیا تحفہ لے جاؤں؟ بیوی نے مشورہ دیا کہ ہمارے گاؤں سے جو نہر جاری ہے، اس کا پانی بہت میٹھا اور صاف شفاف ہے، بادشاہ کو شہر میں ایسا پانی کہاں نصیب ہوگا، اس لئے تم ایک مٹکا پانی کا بھر کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کرو۔ اس دیہاتی کو یہ بات سمجھ میں آ گئی، اس نے ایک مٹکا لیا اور اس کو پانی سے بھر کر سر پر اٹھایا اور بغداد کی طرف پیدل سفر شروع کر دیا۔ اب راستے میں دھول مٹی اس مٹکے کے اندر اور باہر پڑتی رہی، جب کئی دن کے سفر کے بعد وہ بغداد پہنچا تو اس پانی کے اوپر مٹی کی تہہ جم گئی، چنانچہ وہ بادشاہ کے محل پر پہنچا اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور جب ملاقات ہوئی تو اس دیہاتی نے پانی کا مٹکا پیش کرتے ہوئے کہا کہ حضور! یہ میرے گاؤں کی نہر کا صاف اور میٹھا پانی ہے جو میں آپ کے لئے تحفہ لایا ہوں، بادشاہ نے جب وہ

پانی دیکھا تو اس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی اور اس میں سے بدبو اٹھ رہی تھی۔

لیکن بادشاہ نے یہ سوچا کہ اگر میں نے اس کو لوٹا دیا تو اس کا دل ٹوٹے گا، یہ بیچارہ اتنی دور سے محنت مشقت برداشت کر کے لایا ہے، اس لئے بادشاہ نے اس کی تعریف کی اور کہا کہ تم بہت اچھا تحفہ لائے ہو، چنانچہ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کا مٹکا سونے اور چاندی سے بھر کر واپس کیا جائے، پھر بادشاہ نے حکم دیا کہ اس دیہاتی کو دریا دجلہ کے پاس سے واپس لے جانا تاکہ اس کو پتہ چلے کہ یہاں پر اس سے اچھا پانی میسر ہے اور اس میں کوئی کمی نہیں ہے، جب اس دیہاتی کو دریائے دجلہ کے پاس سے گزارا گیا تو اس دریا کو اور اس کے پانی کو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہاں تو بادشاہ کے بالکل قریب اتنا شیریں اور صاف شفاف پانی موجود ہے، اس کے باوجود بادشاہ نے محض اپنی عنایت سے میرا مٹکا نہ صرف قبول کر لیا بلکہ اس کے بدلے سونا چاندی بھی عطا کیا۔

خلوص ومحبّت کا جواب

یہ واقعہ بیان کر کے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حقیقت میں وہ دیہاتی سزا کے لائق تھا کہ اتنی دور سے پانی لایا اور وہ بھی گدلا اور مٹی سے اٹا ہوا کیا وہ پانی اس لائق تھا کہ بادشاہ کو پینے کے لئے پیش کیا جائے؟ لیکن بادشاہ نے اس پانی کے گدلے اور خراب ہونے کو نہ دیکھا بلکہ اس دیہاتی کے دل کے اخلاص کو دیکھا کہ یہ دیہاتی اگرچہ فضول چیز لایا ہے لیکن خلوص کے ساتھ لایا ہے، محبّت سے لایا ہے، اس کے اس خلوص اور محبّت کا جواب یہ ہے کہ

اس کے مٹکے کو سونے چاندی سے بھر کر واپس کیا جائے۔

ہماری عبادات کے جواب میں مغفرت

جب دنیا کا ایک معمولی بادشاہ ایک انسان کے اخلاص کی قدر کرتا ہے تو بادشاہوں کے بادشاہ اور احکم الحاکمین کے دربار میں ہم جو عبادات پیش کرتے ہیں، وہ اس دیہاتی کے پانی کے مٹکے سے زیادہ بے حقیقت ہیں، ان عبادات کی حقیقت تو یہ تھی کہ اس پر الٹی سزا دی جاتی کہ تو ہمارے دربار میں جو عبادت پیش کر رہا ہے، وہ ہمارے دربار کے لائق نہیں ہے، لیکن اللہ جل شانہ اپنے فضل و کرم سے یہ دیکھتے ہیں کہ اس بندے نے خلوص کے ساتھ جو عبادت اس کے بس میں تھی وہ اس نے انجام دیدی، اب ہم اس کے مٹکے کو سونے سے بھر کر واپس کریں گے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا:

يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ (سورۃ الفرقان: آیت ۷۰)

یعنی اللہ تعالیٰ ان کی سیئات کو بھی حسنات سے تبدیل فرمادیں گے۔

خلاصہ

بہرحال! خلاصہ یہ ہے کہ نہ تو اپنے عمل پر ناز ہو اور نہ ہی اپنے عمل سے بے نیازی ہو بلکہ عمل کرتا بھی رہے اور ساتھ میں ڈرتا بھی رہے اور اللہ تعالیٰ سے اپنی مغفرت بھی طلب کرتا رہے، بس یہ کام کرتا رہے تو انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ اس کو منزل تک پہنچا دیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اور اپنی رحمت سے ان باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

حقوق العباد سے توبہ کا طریقہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک

اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶

مجلس نمبر : ۸۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ط

حقوق العباد سے توبہ کا طریقہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِیْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ۔ مَنْ یَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ یُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِیَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِیْکَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا ۔ أَمَّا بَعْدُ!

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

اعمال صالحہ یا توبہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں مگر حقوق معاف نہیں ہوتے، پس جس قدر ہو سکے ادا

کرے اور سب کے ادا کا عزم رکھے۔ اگر کچھ باقی رہ
گئے اور مر گیا تو اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اس کو بری
الذمہ کر دیں گے یعنی اللہ تعالیٰ مظلوم کو خوش کر کے ظالم
کی مغفرت فرمادیں گے۔ (انفاس عیسیٰ، ص ۱۹۸)

گناہ صغیرہ سے معافی کا طریقہ

اس ملفوظ میں حضرت والا نے پہلی بات تو یہ بیان فرمائی کہ اعمال صالحہ یعنی نیک اعمال سے گناہ معاف ہوتے ہیں اور توبہ سے بھی گناہ معاف ہوتے ہیں۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ نیک اعمال سے صرف گناہ صغیرہ معاف ہوتے ہیں اور توبہ سے کبیرہ گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔ گناہ صغیرہ کا معاملہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکیوں کی بدولت خود بخود ان کو معاف فرماتے رہتے ہیں، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ جب آدمی وضو کرتا ہے تو وضو کے دوران جب وہ ہاتھ دھوتا ہے تو ہاتھ سے کئے ہوئے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، جب چہرہ دھوتا ہے تو آنکھوں کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، جب پاؤں دھوتا ہے تو پاؤں سے چل کر جس گناہ کی طرف گیا تھا، وہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان احادیث میں گناہوں سے مراد صغیرہ گناہ ہیں جو اللہ تعالیٰ اس طرح معاف فرماتے رہتے ہیں۔

عبادات سے گناہ صغیرہ معاف ہو جاتے ہیں

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب آدمی نماز کے لئے مسجد کی طرف

چلتا ہے تو ہر ہر قدم پر اللہ تعالیٰ گناہ معاف فرماتے ہیں۔ اس سے بھی مراد صغیرہ گناہ ہیں، اسی طرح نماز پڑھنے سے بھی صغیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک صحابی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھ سے بڑی سخت غلطی ہوگئی ہے، پھر ایک گناہ صغیرہ کو بیان کیا کہ مجھ سے یہ گناہ ہوگیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ کیا تم نے اس گناہ کے بعد ہمارے ساتھ مسجد میں نماز نہیں پڑھی؟ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! نماز تو پڑھی ہے، فرمایا کہ بس تمہارا وہ گناہ اس نماز پڑھنے سے معاف ہوگیا۔ پھر آپ ﷺ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ۔ (سورۃ الہود: آیت ۱۱۴)

یعنی نیکیاں بُرائیوں کو ختم کو دیتی ہیں۔ جب انسان کوئی نیکی کرتا ہے تو اس کے صغیرہ گناہ معاف ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کا یہ خودکار نظام بنا دیا ہے کہ صغیرہ گناہ خود بخود معاف ہوتے چلے جاتے ہیں، مگر یہ سب صغیرہ گناہوں کے بارے میں ہے۔

گناہ کبیرہ کیلئے توبہ ضروری ہے

کبیرہ گناہ کے بارے میں قانون یہ ہے کہ وہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے، یوں اللہ تعالیٰ کسی پر اپنا فضل فرمادیں اور بغیر توبہ کے معاف فرمادیں تو ان کو کون روکنے والا ہے لیکن قانون اور اصول یہ ہے کہ کبیرہ گناہ بغیر توبہ کے

معاف نہیں ہوتے۔ اس ملفوظ میں حضرت والا نے یہ جو فرمایا کہ اعمال صالحہ یا توبہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ اعمال صالحہ سے صغیرہ گناہ اور توبہ سے کبیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

حقوق العباد اور بعض حقوق اللہ محض توبہ سے معاف نہیں ہوتے

آگے فرمایا کہ "مگر حقوق معاف نہیں ہوتے" حقوق سے ایک تو حقوق العباد مراد ہیں اور دوسرے وہ حقوق اللہ مراد ہیں جن کی تلافی ممکن ہو، مثلاً نمازیں چھوٹ گئی ہیں اور آدمی تندرست ہے، ان نمازوں کی قضا کر سکتا ہے، لہٰذا نمازیں معاف نہیں ہوں گی۔ یا مثلاً زکوٰۃ واجب ہوئی اور اب تک زکوٰۃ ادا نہیں کی تو وہ زکوٰۃ معاف نہیں ہوگی، حج واجب ہو گیا تھا، ادا نہیں کیا تو وہ حج معاف نہیں ہوگا، روزے واجب ہو گئے تھے ادا نہیں کیے، وہ معاف نہیں ہوں گے۔ بہرحال! توبہ کے ذریعہ وہ حقوق اللہ جن کی تلافی ممکن ہے وہ معاف نہیں ہوتے اور توبہ کے ذریعہ حقوق العباد معاف نہیں ہوتے جب تک صاحب حق معاف نہ کرے یا اس کا حق ادا نہ کر دیا جائے۔

تمام سابقہ حقوق واجبہ کی ادائیگی شروع کر دیں

حضرت والا فرما رہے ہیں کہ اگر آدمی توبہ کر لینے کے بعد یہ سمجھ لے کہ بس، میرا مقصد حاصل ہو گیا، اب مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، یہ خیال بالکل غلط اور دھوکہ ہے، بلکہ توبہ کر لینے کے بعد یہ دیکھو کہ کیا کیا حقوق میرے ذمے واجب ہیں، چاہے وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق ہوں یا بندوں کے حقوق ہوں،

توبہ کرلینے کے بعد ان حقوق کو ادا کرنے کی فکر شروع کرو۔ جس کا طریقہ میں نے توبہ کا بیان شروع کرتے وقت عرض کیا تھا کہ آدمی ایک کاپی بنالے اور اس کاپی کے اندر یہ لکھے کہ میرے ذمے فلاں فلاں حقوق ہیں، میرے ذمے اتنی نمازیں باقی ہیں، اتنے روزے باقی ہیں، اتنی زکوٰۃ باقی ہے، فلاں فلاں لوگوں کے قرضے باقی ہیں، آج سے میں ان کی ادائیگی شروع کر رہا ہوں، اگر مکمل ادائیگی سے پہلے میرا انتقال ہو جائے تو میرے ترکہ سے ان عبادات کا فدیہ اور قرضہ ادا کر دیا جائے۔

اگر تمام حقوق کی ادائیگی سے پہلے موت آ گئی

اب اگر اس شخص نے ان نمازوں کو ادا کرنا شروع کر دیا، روزوں کو اور زکوٰۃ کو ادا کرنا شروع کر دیا، لوگوں کے جو حقوق واجب تھے ان کی ادائیگی کی فکر شروع کر دی اور کوشش شروع کر دی تو اس شخص کے بارے میں حضرت والا فرما رہے ہیں کہ اگر وہ شخص اس کوشش کے دوران مر گیا یعنی ابھی ساری عباداتِ سابقہ ادا نہیں ہوئی تھیں ابھی تمام حقوق کی ادائیگی کی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ اس سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو گیا، تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرما دیں گے اور معاف کرنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ جن بندوں کے حقوق اس کے ذمے واجب تھے، ان بندوں سے فرمائیں گے کہ یہ میرا بندہ ہے، اس نے حقوق ادا کرنے شروع کر دیے تھے اور اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی لیکن اس کی عمر ختم ہو گئی تھی جس کی وجہ سے پورے حقوق ادا

نہیں کر سکا، لیکن چونکہ اس نے اخلاص کے ساتھ ادائیگی شروع کر دی تھی، اس لئے اب ہم اور بڑی نعمتیں دے کر تمہیں راضی کر دیتے ہیں، لہٰذا اس کے حقوق معاف کر دو۔

حقوق کی معافی کا راستہ

حضرت والا نے یہاں اس ملفوظ میں یہ بات اختصار کے ساتھ بیان فرمائی ہے، لیکن ایک وعظ میں حضرت والا نے یہ بات تفصیل سے بیان فرمائی ہے، چنانچہ آپ نے وہاں پر یہ بیان فرمایا کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حقوق العباد کی معافی کا کوئی راستہ نہیں جب تک ان حقوق کو یا تو ادا نہ کر دیا جائے یا صاحب حق سے معاف نہ کرالیا جائے۔ اس غلط فہمی کے نتیجے میں بعض اوقات لوگوں میں مایوسی پیدا ہو جاتی ہے کہ میرے ذمے اتنے سارے لوگوں کے حقوق واجب ہیں، اگر آج سے میں نے ان حقوق کو ادا کرنا شروع بھی کر دیا تو بھی ساری عمر کھپا دوں گا، تب بھی تمام حقوق ادا نہیں کر سکوں گا، اور جب دل میں مایوسی پیدا ہو جاتی ہے تو پھر جو کچھ تھوڑے بہت حقوق ادا کر سکتا تھا، اس سے بھی رک جاتا ہے۔

مایوس ہونا ٹھیک نہیں

اس لئے ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا مذاق تو یہ تھا کہ:

سوئے نو امیدی مرو امید ھاست
سوئے تاریکی مرو خورشید ھاست

یعنی نا امیدی اور ظلمت و تاریکی کا کوئی راستہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے امید کے راستے رکھے ہیں۔ اس لئے یہ خیال غلط ہے کہ حقوق العباد کی معافی کا کوئی راستہ نہیں، کیونکہ جب اللہ کا ایک بندہ حقوق العباد ادا کرنے کے لئے آمادہ ہوگیا اور حقوق ادا کرنے شروع کر دیے، اپنی سی کوشش صرف کر دی، اس دوران اس کا انتقال ہوگیا تو اللہ تعالیٰ اصحاب حقوق کو راضی فرما دیں گے۔

سو انسانوں کے قاتل کا واقعہ

اس بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مشہور واقعہ سے استدلال فرمایا جو حدیث شریف میں آتا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت میں ایک شخص قاتل تھا، اس شخص نے ننانوے آدمیوں کو قتل کر دیا، ننانوے آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد اس کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہوا کہ یا اللہ! میں نے یہ کیا کر دیا، ایک انسان کی جان لینا ایسا ہے جیسے پورے عالم انسانیت کی جان لے لینا اور قتل نفس کی جو سزا قرآن کریم نے بیان کی ہے، دوسرے کسی گناہ کے لئے ایسی سزا بیان نہیں فرمائی، چنانچہ فرمایا:

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءُهٗ جَهَنَّمُ
خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ
لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ۝ (سورۃ النسا: آیت ۹۳)

یعنی جو شخص جان بوجھ کر کسی مؤمن کو قتل کرے، تو اس کی سزا جہنم ہے اور وہ ہمیشہ اس میں رہے گا اور اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب اور اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوگی

اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ یہ الفاظ کفر کے علاوہ اور قتل نفس کے علاوہ کسی اور گناہ کے لئے بیان نہیں فرمائے۔

سو کا عدد پورا کر دیا

بہر حال ننانوے آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد اس کو فکر ہوئی کہ اب میں کیا کروں، چنانچہ وہ ایک عیسائی پادری کے پاس چلا گیا اور اس سے جا کر کہا کہ میں نے ننانوے قتل کئے ہیں، میری نجات کا کوئی راستہ بتاؤ۔ پادری نے کہا کہ تیری نجات کا کوئی راستہ نہیں، کیونکہ ایک آدمی کو قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے، تو نے تو ننانوے انسانوں کو قتل کر دیا، لہٰذا تیری نجات کا تو کوئی راستہ نہیں، تو تو جہنمی ہے۔ اس شخص کو بڑا غصہ آیا کہ میں تو نجات کا راستہ پوچھنے آیا اور یہ کہتا ہے کہ کوئی راستہ نہیں، اس نے سوچا کہ ننانوے قتل تو کر دیے ہیں، ایک اور سہی تاکہ سو کا عدد پورا ہو جائے، چنانچہ اس نے اس پادری کو بھی قتل کر دیا۔

پھر کسی اور راہب کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ میں نے سو انسانوں کو قتل کر دیا ہے، میری نجات کا کوئی راستہ بتاؤ۔ اس راہب نے کہا کہ تم توبہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو اور ایسا کرو کہ فلاں بستی کے لوگ بہت نیک ہیں، تم اس بستی میں جا کر رہو۔ اس راہب کا مقصد یہ تھا کہ جب یہ شخص اس بستی میں رہے گا تو نیک لوگوں کی صحبت حاصل ہوگی، اس کے ذریعہ اس کے حالات درست ہو جائیں گے اور جو گناہ اس نے کئے ہیں، اس کی تلافی کی کوشش کرے گا، چنانچہ یہ شخص اس بستی کی طرف چل پڑا۔

رحمت اور عذاب کے فرشتوں میں جھگڑا

ابھی راستے میں یہ تھا کہ اس کی موت آ گئی اور اس کا انتقال ہو گیا، حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس کے بارے میں ملائکہ رحمت اور ملائکہ عذاب کے درمیان جھگڑا ہو گیا، ملائکہ عذاب نے کہا کہ یہ شخص سو قتل کر کے آیا ہے، لہٰذا یہ ہمارا آدمی ہے، اس کو ہم جہنم میں لے جائیں گے۔ ملائکہ رحمت نے کہا کہ یہ شخص توبہ کر کے نیک بننے کے لئے چل پڑا تھا، لہٰذا یہ ہمارا آدمی ہے، ہم اس کو جنت میں لے جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا فیصلہ

جب یہ دونوں جھگڑنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ جہاں سے یہ شخص چلا تھا، اس کی پیائش کرو اور جس بستی کی طرف جا رہا تھا، اس کی پیائش کرو اور یہ دیکھو کہ موت کے وقت کونسی جگہ سے قریب تھا؟ جس بستی سے روانہ ہوا، اس سے قریب تھا یا جس بستی کی طرف جا رہا تھا، اس سے قریب تھا؟ پھر جس بستی سے یہ شخص قریب ہو، اسی کا معاملہ کرو۔

چنانچہ دونوں طرف کے راستوں کی پیائش کی گئی تو وہ جس بستی کی طرف جا رہا تھا، اس طرف ایک گز زیادہ قریب تھا، گویا کہ آدھے راستے سے ایک گز آگے بڑھ گیا تھا، اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ اس شخص کو رحمت والے فرشتوں کے حوالے کر دیا جائے۔

اس واقعہ سے حضرت تھانویؒ کا استدلال

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ سے استدلال فرمایا کہ اس شخص نے جو سو قتل کئے تھے، وہ حقوق العباد سے متعلق تھے، لیکن چونکہ وہ شخص حقوق العباد کی ادائیگی کا عزم کر کے چل پڑا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ اس نے شخص کی توبہ قبول فرمائی اور اس کو بخش دیا۔اور جہاں تک تعلق ہے ان بندوں کا جن کو قتل کیا تھا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان مقتولین کے درجات بلند کر کے ان کو راضی کر دیں گے۔

پیمائش کرانے کی کیا ضرورت تھی؟

اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ جو حکم فرمایا کہ دونوں طرف کے راستوں کی پیمائش کرو اور دیکھو کہ کونسی بستی زیادہ قریب ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو بخشنے کا ارادہ کر ہی لیا تھا تو پیمائش کرانے کی کیا ضرورت تھی؟ فرض کرو کہ اگر اس شخص کی موت ایک دو گز پہلے آ جاتی تب بھی تو اس نے توبہ کا ارادہ کر ہی لیا تھا اور اپنی سی کوشش شروع کر دی تھی، لہٰذا پیمائش کرانے اور قریب اور دور ہونے کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ اشکال میرے ذہن میں بہت عرصے سے تھا اور میں اس تلاش میں تھا کہ اس کا جواب کہیں مل جائے۔

حقوق العباد کی ادائیگی کیلئے اپنی طرف سے قدم بڑھانا شرط ہے

بعد میں اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اس کا یہ جواب ڈالا کہ اللہ تعالیٰ کے پیائش کرانے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ پیائش کرانے کے بعد فیصلہ فرمائیں گے، بلکہ اس کی معافی کا فیصلہ تو پہلے ہی فرما چکے تھے، اس پر نوازش ہو چکی تھی، لیکن بندوں کو یہ بتانے کے لئے پیائش کی گئی کہ یہ معافی کا معاملہ اس وقت ہوتا ہے جب آدمی اصلاح کے راستے پر معتدبہ راستہ چل پڑا ہو، یہ نہیں کہ کسی نے اپنی اصلاح کا اور تبدیلی لانے کا جھوٹا موٹا ارادہ کرلیا پھر سستی کے عالم میں پڑا رہا، اس کے ساتھ معافی کا معاملہ نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اس واقعہ کے ذریعہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اصلاح کا ارادہ کرنے کے بعد معتدبہ قدم اٹھنے چاہئیں، معتدبہ راستہ قطع ہونا چاہئے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت آئیگی۔ یہ نہ ہو کہ کسی کے وعظ و تقریر میں نصیحت کی بات سن لی اور ارادہ کرلیا کہ اس نصیحت پر ضرور عمل کریں گے، لیکن کیا کچھ نہیں، تو ایسے ارادے کا کوئی اعتبار نہیں۔ لہٰذا بندوں پر یہ بات ظاہر کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ اس زمین کی پیائش کرو اور یہ دیکھو کہ اس نے معتدبہ راستہ قطع کرلیا تھا یا نہیں؟ جب پیائش کے بعد پتہ چل گیا کہ اس شخص نے معتدبہ راستہ طے کرلیا تھا، تب اس کی معافی کا فیصلہ فرمایا۔

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ گناہ صغیرہ کی معافی کا راستہ اللہ تعالیٰ نے اعمال صالحہ کو بنا

دیا ہے اور وہ گناہ کبیرہ جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے اور جن کی تلافی ممکن نہیں، ان کی معافی کے لئے توبہ ہے اور وہ گناہ کبیرہ جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے یا ان حقوق اللہ سے ہے جن کی تلافی ممکن ہے، ان کی معافی کا راستہ یہ ہے کہ اہتمام کر کے ان کی ادائیگی شروع کر دے اور ساتھ میں وصیت بھی کر دے کہ اگر میں ان کو مکمل نہ کر سکا تو میرے ترکہ میں سے ان عبادات کا فدیہ اور قرضہ ادا کر دیا جائے۔ جب یہ سب کر لیا تو بندے نے اپنے حصے کا کام کر لیا، اب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ اس کا بیڑہ پار کر دیں گے۔

گناہ کا تقاضہ گناہ نہیں

آگے ایک ملفوظ میں حضرت والاؒ نے ارشاد فرمایا:

> امور طبعیہ پر مؤاخذہ نہیں بلکہ ان کے مقتضاء پر عمل کرنے سے مؤاخذہ ہوتا ہے، وہ بھی اس وقت جبکہ عمداً اس پر عمل کیا جائے، اور اگر طبعی ناگواری سے مغلوب ہو کر کسی وقت کوئی کلمہ بیجا زبان سے نکل جائے اور بعد میں اس سے معذرت کر لی جائے تو حق تعالیٰ اس کو معاف فرمائیں گے۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۹۸)

اس ملفوظ میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بہت اہم اصول بیان فرمایا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ گناہوں کا صدور یا تو طبعی داعیہ اور محرکات کے ذریعہ ہوتا ہے یا انسان کے اندر جو اخلاق رذیلہ ہوتے ہیں وہ انسان کو گناہ پر

آمادہ کرتے ہیں۔ اب بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف گناہ کے داعیے اور تقاضے کا دل میں پیدا ہو جانا ہی گناہ ہے۔ حضرت والا اس غلط فہمی کو دور فرما رہے ہیں کہ محض تقاضہ کا دل میں پیدا ہو جانا گناہ نہیں جب تک انسان اس تقاضے پر عمل نہ کرے۔

غصّہ کا علاج سب سے مقدم

مثلاً غصہ کرنا بُرا ہے اور یہ ان چیزوں میں سے ہے کہ تصوّف اور طریقت میں سب سے پہلے اس کا علاج کیا جاتا ہے، یہ غصہ انسان کے باطن کو بالکل تباہ کرنے والا ہے، اس لئے جب کوئی اللہ کا بندہ اپنی اصلاح کے لئے کسی شیخ کے پاس جاتا ہے تو پہلے قدم کے طور پر اس کے غصّے کی اصلاح کی جاتی ہے تا کہ اس کا غصہ قابو میں آجائے۔

غصّہ اور شہوت کے تقاضے پر عمل کرنا گناہ ہے

اب بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ غصّے کا دل میں پیدا ہونا ہی گناہ ہے۔ حضرت والا فرما رہے ہیں کہ محض غصہ کا دل میں پیدا ہو جانا گناہ نہیں بلکہ گناہ اس وقت ہوگا جب اس غصہ کے تقاضے پر عمل کر کے کسی کے ساتھ زیادتی کرو گے۔ اسی طرح شہوت ہے، شہوت کے خیال کا دل میں خود بخود پیدا ہو جانا گناہ نہیں، لیکن اگر اس خیال کو جان بوجھ کر پیدا کرے گا یا اس خیال کو جان بوجھ کر باقی رکھے گا یا اس شہوت کے تقاضے پر کوئی ایسا عمل کر گزرے گا جو شرعاً ناجائز ہے تو گناہ گار ہوگا، مثلاً شہوت کا خیال آنے کے نتیجے میں نگاہ غلط جگہ پر ڈال

دی تو اب وہ گناہ گار ہوگا۔ سارے امراض باطنہ اور رذائل کا یہی معاملہ ہے۔

حسد کے تقاضے پر عمل کا گناہ ہے

مثلاً ''حسد'' ہے، آپ کے دل میں کسی شخص کی طرف سے حسد ہے، اب اس کے بارے میں کسی اچھائی کی خبر سن کر آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ کیوں آگے بڑھ گیا؟ اس کے پاس پیسے کیوں زیادہ آگئے؟ اس کے پاس دولت کیوں زیادہ ہوگئی؟ اس کی شہرت کیوں زیادہ ہوگئی؟ لوگ اس کو کیوں زیادہ ماننے لگے؟ وغیرہ۔ صرف دل میں اس خیال کا پیدا ہو جانا یہ گناہ نہیں، کیونکہ یہ خیال غیر اختیاری طور پر دل میں پیدا ہوا ہے، یہ خیال اس وقت گناہ بنے گا جب تم اس خیال کے آنے کے نتیجے میں اس شخص کے ساتھ کوئی بدسلوکی کرو گے، مثلاً آپ کے دل میں یہ خیال آیا کہ فلاں شخص مجھ سے آگے بڑھ گیا، یہ تو بہت بُرا ہوا، اب تم نے سوچا کہ کوئی ایسا کام کرو کہ اس کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ پیدا ہو جائے، مثلاً اس کی چغلی کرو، لوگوں کے سامنے اس کی بُرائی بیان کرو، اس کی غیبت کرو، تو ان کاموں کے کرنے کے نتیجے میں وہ حسد گناہ بن جائے گا، محض دل میں خیال آجانے سے گناہ نہیں بنتا۔

حسد کے دو علاج

البتہ ''حسد'' کے بارے میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کے دل میں دوسرے کی بُرائی کا خیال آرہا ہو، اس کو فوراً دو کام کرنے

چاہئیں ورنہ وہ حسد کے نتیجے میں گناہ کے اندر مبتلا ہو جائے گا۔ ایک کام یہ کرے کہ اس خیال کو دل میں بُرا سمجھے کہ میرے دل میں یہ جو خیال آ رہا ہے، یہ بہت برا خیال ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرے کہ یا اللہ! یہ بُرا خیال میرے دل سے نکال دیجئے۔ دوسرا کام یہ کرے کہ جس شخص کی طرف سے یہ بُرا خیال آ رہا ہے، اس کے حق میں دعائے خیر کرے، مثلاً آپ کے دل میں اس بات کا دکھ ہو رہا ہے کہ فلاں شخص مجھ سے آگے کیوں نکل گیا، اس کے لئے یہ دعا کرے کہ یا اللہ! اس کو اور ترقی عطا فرما۔ جب تم یہ دعا کرو گے تو دل پر آرے چل جائیں گے، لیکن یہ آرے چلانے مقصود ہیں تا کہ اس بیماری کا علاج ہو۔ اگر اس کی دولت کی وجہ سے اس پر حسد ہو رہا تھا تو اس کے لئے یہ دعا کرو کہ یا اللہ! اس کو اور دولت عطا فرما۔ اگر اس کے منصب کی وجہ سے حسد ہو رہا تھا تو یہ دعا کرو کہ یا اللہ! اس کو اور بڑا منصب عطا فرما۔ اس کو اور زیادہ ترقی عطا فرما، لہٰذا جس چیز کی وجہ سے حسد ہو رہا تھا، اس کی زیادتی کی دعا کرے، جب حسد پیدا ہو تو فوراً یہ دو کام کرے ورنہ یہ حسد کسی نہ کسی وقت آدمی کو تباہ کر دے گا۔

بہر حال! جتنے بھی بُرے اخلاق ہیں، ان سب کا اصول حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملفوظ میں بیان فرمایا کہ ''محض امور طبعیہ پر مؤاخذہ نہیں، بلکہ ان کے مقتضاء پر عمل کرنے سے مؤاخذہ ہوتا ہے''۔ پھر فرمایا کہ ''وہ بھی اس وقت جب کہ عمداً اس پر عمل کیا جائے۔

طبعی ناگواری سے مغلوب ہوکر زبان سے نکلنے والے کلمات

آگے بڑی چھوٹ والی بات ارشاد فرمادی کہ "اگر طبعی ناگواری سے مغلوب ہوکر کسی وقت کوئی کلمہ بیجا زبان سے نکل جائے اور بعد میں اس سے معذرت کرلی جائے تو حق تعالیٰ اس کو معاف فرمادیں گے"۔ یعنی ویسے تو غصہ قابو میں آگیا ہے اور کسی شخص کی صحبت کے نتیجے میں اور اس کے آگے رگڑے کھانے کے نتیجے میں طبیعت میں ایک اعتدال پیدا ہونے لگا اور غصہ قابو میں آنے لگا، لیکن پھر بھی کسی کسی وقت وہ غصہ بے قابو ہو جاتا ہے، جیسے کسی بات پر ناگواری پیدا ہوئی، اس کے نتیجے میں ایک دم سے بھڑک اٹھا اور اس کی وجہ سے زبان سے کوئی نازیبا کلمہ نکل گیا تو ایسا ہو جاتا ہے، اس کے بارے میں یہ نہ سمجھے کہ یہ کوئی غیر معمولی اور ناقابل اصلاح بات ہوگئی۔ البتہ جب ایسا ہو جائے تو جس کے ساتھ اس قسم کا معاملہ ہوا تھا، اس سے معذرت کرلے لیکن یہ نہ سمجھے کہ اب میرا غصہ قابل اصلاح نہیں بلکہ اپنے غصہ کی اصلاح کی فکر کرے۔

ایک صحابی کو غصہ نہ کرنے کی نصیحت

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے نصیحت فرمائیے اور مختصر نصیحت فرمائیے۔ ایک تو نصیحت کی درخواست کی اور ساتھ مختصر

نصیحت کی درخواست کی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو برا نہیں مانا کہ تم نصیحت بھی طلب کرتے ہو اور ساتھ میں شرطیں بھی لگاتے ہو اور نہ اس پر ناگواری کا اظہار فرمایا بلکہ آپ نے اس کی اس فرمائش کی تعمیل فرمائی۔ اس سے پتہ چلا کہ اگر کوئی شخص مختصر نصیحت طلب کرے تو اس کو مختصر نصیحت کردو، اس لئے کہ اس کے پاس وقت کم ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ ایک منٹ میں مجھے کوئی دین کی بات حاصل ہو جائے، اس کی اس فرمائش کو پورا کردو، اس لئے کہ دین کی باتیں ایسی بھی ہیں جو ایک منٹ یا دو منٹ میں بھی ہو سکتی ہیں۔ بہرحال! ان صحابی کی فرمائش پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نصیحت فرمائی کہ:

لَا تَغْضَبْ

غصہ مت کرنا۔ اس سے پتہ چلا کہ غصہ ان چیزوں میں سے ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اس کی اتنی اہمیت تھی کہ مختصر نصیحت کے وقت آپ نے اسی کا انتخاب فرمایا۔

ابتداء بالکل غصہ کرنا چھوڑ دو

اسی لئے ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے طریق میں غصہ ان چیزوں میں سے ہے جس کا سب سے پہلے علاج کیا جاتا ہے، جب کوئی شخص کسی شیخ کی خدمت میں اپنی اصلاح کے لئے جاتا ہے تو شروع میں اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ تم غصہ بالکل مت کرو، نہ غصہ کے صحیح محل پر غصہ کرو اور نہ ہی بے محل غصہ کرو، جہاں غصہ کرنے کا حق ہے وہاں بھی

غصہ نہ کرو تاکہ تمہاری طبیعت اعتدال پر آجائے۔ لیکن اس کے باوجود کسی وقت غیر اختیاری طور پر منہ سے نازیبا کلمات نکل جائیں تو جس کے خلاف وہ کلمات نکلے ہیں، اس سے معافی مانگ لو، معذرت کرلو کہ بھائی! میرے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے، غلطی ہوگئی، معاف کردو، جب یہ کرلو گے تو انشاء اللہ آئندہ کے لئے راستہ کھل جائے گا۔

معافی مانگنے سے شرم مت کرو

معافی مانگ لینے میں کوئی ذلت نہیں ہے، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جان جائے مگر ناک نہ جائے، کسی طرح ناک نیچی نہ کرنی پڑے۔ یہ تصور اور خیال بہت خراب ہے، کیونکہ تکبر پر مبنی ہے، اس لئے جب کبھی ایسا ہو جائے، معافی مانگ لو، معافی مانگنے میں کیا رکھا ہے، اگر دنیا میں معافی مانگ لی تو یہاں معافی ہو جائے گی، اگر خدانخواستہ یہاں معاف نہیں کرایا اور آخرت میں جاکر حساب کتاب دینا پڑا تو اس کا بڑا خطرناک انجام ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو بھی ان باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ یہاں پر توبہ کا بیان ختم ہوگیا، اب آگے دوسرا باب شروع ہو رہا ہے، جس کا عنوان ہے ''تعلق مع اللہ'' انشاء اللہ کل اس کو شروع کریں گے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

✿✿✿

✿

اللہ تعالیٰ کی محبت

اور اس کے اسباب

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک

اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶

مجلس نمبر : ۸۳

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

اللہ تعالیٰ کی محبت

اور

اس کے اسباب

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین أمابعد!

محبت کے اسباب اختیاری ہیں

آگے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے چند ارشادات اللہ تعالیٰ کے محبت اور تعلق مع اللہ سے متعلق ہیں، پہلے ملفوظ میں حضرت والا نے فرمایا:

"خدا کی محبت اگرچہ امر غیر اختیاری ہے، لیکن اس کے اسباب بندے کے اختیار میں ہیں، وہ یہ ہیں (۱) کثرت ذکر اللہ (۲) اللہ تعالیٰ کے انعامات کو اور اپنے برتاؤ کو سوچنا (۳) کسی اہل اللہ سے تعلق رکھنا (۴) طاعت پر مواظبت کرنا (۵) حق تعالیٰ سے دعا کرنا، اس تدبیر میں تو کوئی غلطی نہیں، صرف ایک غلطی علمی محتمل

ہے، وہ قابل تنبیہ ہے، وہ یہ کہ اپنے ذہن سے کوئی درجہ محبت کا تراش کر اس کا منتظر رہنا، یہ غلطی ہوگی، بلکہ اس تدبیر کی مداومت سے جو درجہ محبت کا حاصل ہوتا ہے، وہی اس درجہ میں مطلوب ہے، پھر خواہ اس میں مزعوم ترقی ہو، خواہ ایک حالت پر رہ جائے، البتہ رسوخ میں ترقی لازم ہے، صرف لون محبت میں تفاوت ہوتا رہتا ہے"

(انفاس عیسیٰ: ص ۱۹۹)

ان چند جملوں میں بڑے بڑے مضامین ارشاد فرمادئے ہیں، ان سے مقصود یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی محبت اور اللہ جل شانہ سے تعلق حصول دین کی تمام جدوجہد کا مغز ہے، یہ جو آپ سنتے ہیں کہ حضرات اولیاء کرام اور صوفیاء کرام کی خدمت میں لوگ جاتے تھے اور وہاں مجاہدے اور ریاضتیں کرتے تھے، ان سب کا مقصود یہی تھا کہ تعلق مع اللہ پیدا ہو جائے، اور یہ تعلق مضبوط ہو جائے، بس جس دن یہ چیزیں حاصل ہوگئیں، اس دن پورا دین حاصل ہوگیا، کیونکہ محبت وہ چیز ہے جو مشکل سے مشکل کام کو آسان بنادیتی ہے۔

محبت مشکل کام کو آسان کر دیتی ہے

اگر جائزہ لے کر دیکھو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دین پر عمل کرنا بڑا مشکل کام ہے، اتنی نمازیں پڑھو، اتنے روزے رکھو، اتنی زکوٰۃ دو، حج کرو، اور ان سب سے مشکل یہ ہے کہ فلاں گناہ سے بچو، فلاں گناہ سے بچو، آنکھوں کو بچاؤ، اپنے کانوں کو

بچاؤ، زبان کو بچاؤ، ان سب کو بچانا آدمی کو مشکل معلوم ہوتا ہے، لیکن جس دن اللہ تعالیٰ سے محبت ہوگئی اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم ہوگیا، اس دن یہ سب کام آسان ہوجائیں گے، مولانا رومی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

ع : از محبت تلخہا شیریں شود

''یعنی جب محبت پیدا ہوجاتی ہے تو کڑوی چیزیں بھی میٹھی لگتی ہیں''

ماں کو بچے سے محبت کا نتیجہ

ایک ماں کو دیکھو کہ سردی کا موسم ہے، کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا ہے، اب رات کو بچے نے بستر پر پیشاب پاخانہ کردیا، اب سخت سردی میں بستر سے اٹھنا اور جاکر بستر وغیرہ دھونا، اس کے کپڑے دھونا کتنا مشکل کام ہے، لیکن چونکہ ماں کو بچے کے ساتھ محبت ہے، اس لئے وہ سب کام خوشی کے ساتھ آسانی کے ساتھ کررہی ہے، اگر اس ماں سے کوئی شخص کہے کہ اس بچے کی وجہ سے تمہیں رات کو تکلیف ہوتی ہے، سردی میں تمہیں اٹھنا پڑتا ہے، اس کا بستر صاف کرنا پڑتا ہے، یہ بچہ مرجائے تو اچھا ہے، تو وہ ماں اس شخص کو اپنا دشمن سمجھے گی اور یہ کہے گی کہ میں اس طرح کی ہزاروں تکلیفیں برداشت کرنے کو تیار ہوں، لیکن کسی طرح میرا یہ جگر کا ٹکڑا مجھ سے جدا نہ ہو، چونکہ اس بچے سے ماں کو محبت ہوگئی ہے، اس لئے وہ ساری تکلیفیں اس کے لئے آسان ہوگئیں۔

تنخواہ سے محبت کا نتیجہ

ایک شخص رمضان کی رات میں عبادت کرتا ہے، سحری کے لئے بیدار ہوتا

ہے، پھر صبح سویرے اٹھ کر دفتر کی طرف بھاگتا ہے، اب بھری بس کے اندر ڈنڈا پکڑا بس کے دروازے پر لٹک کر سفر کر رہا ہے، دفتر پہنچ کر آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی دے رہا ہے، اور شام کو تھکا ماندہ چلا آرہا ہے، وہ یہ ساری مشقتیں برداشت کر رہا ہے، لیکن یہ ساری مشقتیں اس کے لئے آسان ہوگئیں، کیونکہ اس کو اس تنخواہ سے محبت ہوگئی ہے جو مہینے کے آخر میں ملنے والی ہے، اگر کوئی شخص اس سے یہ کہے کہ تمہیں رمضان کے مہینے میں بڑی مشقت اٹھانی پڑتی ہے، صبح ہی صبح دفتر کی طرف بسوں میں لٹک کر جانا پڑتا ہے، وہاں پر آٹھ گھنٹے کی مشقت والی نوکری کرنی پڑتی ہے، چلو میں تمہاری یہ نوکری چھڑوا دیتا ہوں، وہ اس شخص کو دشمن سمجھے گا کہ میری اچھی بھلی نوکری لگی ہوئی ہے، یہ اس کو چھڑوا رہا ہے، اس کے لئے اس تنخواہ سے محبت ہونے کی وجہ سے صبح سویرے اٹھنا اور بسوں میں لٹک کر سفر کرنا اور آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی دینا یہ سب کام محبوب ہو گئے، اسی کو مولانا رومی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ از محبت تلخہا شیریں شود، یعنی محبت سے کڑوی چیزیں بھی میٹھی ہو جاتی ہیں۔

قلندری راستہ دکھادیں

اسی طرح دین کے جتنے کام مشکل نظر آرہے ہیں، اس کو آسان بنانے کا راستہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی محبت دل میں پیدا ہو جائے، تعلق پیدا ہو جائے تو اس محبت کے نتیجے میں یہ سارے کام آسان ہو جائیں گے، اسی بات کو کسی نے دوسرے انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ:

صنمارہ قلندر سزاوار بمن نمائی

دراز و دور دیدم راہ و رسم و پارسائی

یعنی مرید اپنے شیخ سے کہہ رہا ہے کہ مجھے تو قلندری راستہ دکھا دیجئے، کیونکہ نیکی اور پارسائی کا راستہ تو مجھے لمبا چوڑا نظر آ رہا ہے کہ نمازیں پڑھو، تہجد پڑھو، اشراق پڑھو، چاشت کی نماز پڑھو، ذکر کرو، نگاہ کی حفاظت کرو، زبان کی حفاظت کرو، کان کی حفاظت کرو، ہر چیز کو بچاؤ، یہ کام تو میرے لئے بڑا مشکل ہے، مجھے تو کوئی قلندری راستہ بتا دیجئے۔

اس شعر کا صحیح مطلب

بعض لوگوں نے اس شعر کا بڑا غلط مطلب نکالا ہے، اور وہ یہ کہ شاعر کا کہنا یہ ہے کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ جو ظاہری اعمال ہیں ان کو انجام دینا تو بڑا مشکل ہے، ان کے بجائے مجھے شورٹ کٹ (مختصر راستہ) بتا دو، جیسے آج کل کے جاہل پیر بتاتے ہیں، جس کے ذریعہ میں آسانی سے سیدھا جنت میں پہنچ جاؤں۔ ان جاہلوں نے شعر کا یہ مطلب نکالا ہے، حالانکہ یہ مطلب درست نہیں، بلکہ اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ یہ "راہ و رسم و پارسائی" کا یہ راستہ مجھے بڑا لمبا نظر آ رہا ہے، اس لئے مجھے ایسا راہ قلندری بتا دیجئے جس سے میرے لئے یہ راستہ آسان اور مختصر ہو جائے، اگرچہ مجھے جانا اسی راستے ہے، نماز، روزہ بھی کرنا ہے، زکوٰۃ اور حج بھی ادا کرنے ہیں، لیکن مجھے کوئی ایسا طریقہ بتا دیجئے جس سے یہ اعمال میرے لئے آسان ہو جائیں، اسی کا نام "طریق القلندر" ہے اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک وعظ ہے جس کا نام ہی "طریق القلندر" ہے، وہ وعظ اسی شعر کی تشریح پر ہے،

وہ بڑا عجیب وغریب وعظ ہے، ہر ایک کو پڑھنا چاہئے۔

’’طریق القلندر‘‘ اللہ کی محبت پیدا کرنا ہے

وہ ’’طریق القلندر‘‘ محبت کا پیدا کر دینا ہے، اللہ جل شانہ کے ساتھ تعلق کا پیدا ہو جانا، جس دن اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا ہو گئی اور اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہو گیا، اس کے بعد یہ راستہ لمبا نہیں رہے گا، بلکہ یہ راستہ مختصر اور آسان ہو جائے گا، اس کی مثال یہ سمجھو کہ ایک شخص سفر سے بہت گھبراتا ہے، اس سے سفر نہیں کیا جاتا، کوئی شخص اس سے کہے کہ میرے ساتھ لاہور چلو، وہاں لاہور میں تمہارے دوست ہیں، احباب ہیں، وہ کہتا ہے کہ یہ میرے بس کا کام نہیں، میں نہیں جاتا، اس شخص کو لاہور جانا مشکل معلوم ہو رہا ہے۔

لاہور کا سفر آسان ہو گیا

اب اس شخص کو لاہور لے جانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے لئے لاہور میں کوئی ایسی محبت کی چیز پیدا کر دو کہ پھر اس کے لئے یہ سفر آسان ہو جائے، مثلاً اس سے یہ کہا جائے کہ اگر تم لاہور جاؤ گے تو وہاں کا بادشاہ تمہیں اپنا مقرب بنالے گا اور تم اس کے مصاحب بن جاؤ گے، اور تمہاری اتنی تنخواہ ہوگی، اور یہ سہولتیں تم کو ملیں گی، اب اس سے کہا جائے کہ لاہور چلو تو وہی آدمی جو یہ کہہ رہا تھا کہ میرے لئے سفر کرنا مشکل ہے، ریل میں کیسے سوار ہوں، کیسے ۲۴ گھنٹے کا سفر کروں، اسی کو جب آپ نے ذرا سی لالچ دیدی تو چونکہ وہ لالچ ایسی ہے کہ اس کا تعلق دل سے ہے،

اس وجہ سے وہ سفر اس کے لئے آسان ہوگیا، اور وہی شخص اب کہتا ہے کہ مجھے دس مرتبہ لاہور کا سفر کرادو، میں سفر کرنے کے لئے تیار ہوں، اس لئے کہ محبت پیدا ہوگئی۔

سارا کھیل محبت کا ہے

بہر حال، یہ سارا کھیل محبت کا ہے، اگر اللہ تعالیٰ سے دل میں محبت پیدا ہو جائے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہو جائے تو یہی راستہ جس کو لمبا سمجھ رہا تھا، لمحوں میں طے ہو جاتا ہے، پھر اس میں کوئی دشواری اور پریشانی باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا یہ جو اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر بزرگوں کے پاس جائیں گے تو کیا ملے گا؟ اس بزرگ کے پاس دین کا کوئی ایسا علم ہے نہیں جو دوسروں کے پاس نہ ہو، کتابوں کے اندر بھی دین کی باتیں موجود ہیں اور اس بزرگ کے پاس کوئی ایسا عمل اور جادو منتر بھی نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ وہ تمہیں عمل کے راستے پر ڈال دے گا، بزرگ کے پاس جا کر کیا ملتا ہے؟

اللہ والوں سے اللہ کی محبت ملتی ہے

اصل بات یہ ہے کہ ان کے پاس جانے سے اللہ کی محبت دل میں پیدا ہوتی ہے اور تعلق مع اللہ پیدا ہوتا ہے، جو کامیابی کی کنجی ہے، اگر یہ دو چیزیں حاصل ہوگئیں تو سب کچھ حاصل ہوگیا، جو لوگ بزرگوں کے پاس اور مشائخ کے پاس جاتے ہیں، وہ یہی چیزیں لینے جاتے ہیں، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ یہ شعر بکثرت پڑھا کرتے تھے:

زهد زاهد را و دیں دیندار را
اِک ذرۂ دردِ دلِ عطّار را

یہ شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کا شعر ہے، اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ آپ زاہد کو زہد دیتے رہیں، اور دیندار کو دین دیتے رہیں، عطّار کو تو بس دردِ دل کا ایک ذرہ عطا فرما دیجئے۔ اب بظاہر تو ان دونوں باتوں میں تضاد نظر آرہا ہے، کیونکہ ایک طرف تو یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے نہ دین چاہئے اور نہ مجھے زہد چاہئے دوسری طرف یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے دردِ دل کا ذرہ چاہئے، لیکن حقیقت میں وہ دونوں باتوں میں تضاد کا اظہار نہیں کررہے ہیں، بلکہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ لوگ دوسرے راستے سے دین کی طرف جارہے ہیں، مجھے تو وہ چیز چاہئے کہ اس کے حاصل ہونے بعد زہد اور دینداری وغیرہ یہ سب خود بخود اس کے پیچھے چلی آئیں، وہ چیز ہے ''دردِ دل'' جس دن یہ مل گیا اس دن یہ زہد اور دینداری اس کے پیچھے خود بخود چلی آئیں گی، چنانچہ سارے مجاہدات اور ساری ریاضتوں سے مقصود اللہ جل شانہ کی ''محبت'' کا حصول ہے، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا مضبوط ہونا ہے، مشائخ کی صحبت اور ان کی تعلیم وتربیت سے بھی ان دو چیزوں کا حصول مقصود ہوتا ہے۔

تھانہ بھون میں اقطاب ثلاثہ

تھانہ بھون کی خانقاہ میں ایک زمانہ میں تین بزرگ رہتے تھے، جن کو ''اقطاب ثلاثہ'' کہا جاتا تھا، ایک حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ، دوسرے حضرت شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، اور تیسرے حضرت حافظ ضامن

شہید رحمۃ اللہ علیہ، یہ تینوں اپنے وقت کے ''قطب'' تھے، اور ہر ایک کو اللہ تعالیٰ نے عجیب کمالات عطا فرمائے تھے، خانقاہ میں ان کے کمروں کی ترتیب یہ تھی کہ خانقاہ میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ کا کمرہ تھا، اس کے بعد حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا کمرہ تھا، اس کے بعد حضرت شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا کمرہ تھا، مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ عالم بھی تھے اور باکمال صوفی بھی تھے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا مناظرے کا ارادہ

حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے کسی فقہی موضوع پر ایک رسالہ لکھ دیا، اس زمانے میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نئے نئے دار العلوم دیوبند سے فارغ ہوئے تھے، اس لئے ان کا علم تازہ تھا، جب مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا وہ رسالہ پڑھا تو ان کو اس سے کچھ اختلاف ہو گیا کہ اس میں فلاں بات صحیح نہیں لکھی۔ جب طالب علم نیا نیا دورۂ حدیث سے فارغ ہوتا ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ ''ہم چوں دیگر نیست'' وہ سمجھتا ہے کہ ساری دنیا کا علم میرے پاس آ گیا ہے اور ساری دنیا جاہل ہے۔ چنانچہ ان کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ جس شخص نے یہ رسالہ لکھا ہے اس سے مناظرہ کروں گا، لوگوں سے پوچھا کہ یہ مولانا شیخ محمد تھانوی کہاں رہتے ہیں، لوگوں نے بتایا کہ تھانہ بھون میں رہتے ہیں، چنانچہ تھانہ بھون گئے اور تلاش کرتے ہوئے خانقاہ میں پہنچ گئے۔

مناظرہ کرنا بھول کر اشغال میں مشغول ہو گئے

جب خانقاہ میں داخل ہوئے تو چونکہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو پہلے سے جانتے تھے، اس سے پہلے کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں، حضرت حاجی صاحب کا کمرہ خانقاہ میں پہلے پڑتا تھا، جب حاجی صاحبؒ نے حضرت گنگوہیؒ کو جاتے ہوئے دیکھا تو ان کو بلا لیا اور پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ حضرت! شیخ محمد تھانوی صاحب نے بڑی بات کتاب میں لکھ دی ہے، اس پر ان سے مناظرہ کرنے جا رہا ہوں، حضرت حاجی صاحب نے ان کو اپنے پاس بٹھا لیا، اور فرمایا توبہ، توبہ، ایسی بات نہیں کرتے، وہ بزرگ آدمی ہیں، اتنے بڑے آدمی ہیں، تم ایک طالبعلم ہو کر ان سے مناظرہ کرو گے؟ یہ بڑی بے ادبی کی بات ہے، پھر حضرت حاجی صاحب نے ان کو ایسا مصروف کر دیا کہ وہ مناظرہ کرنا تو بھول گئے اور حضرت حاجی صاحب کے پاس رہ پڑے اور ان سے بیعت ہو گئے اور بیعت ہونے کے بعد ذکر و اذکار اور تعلیمات و اشغال کے اندر مشغول ہو گئے۔

جو کچھ دینا تھا وہ دے چکے

تھانہ بھون تو اس خیال سے آئے تھے کہ مناظرہ کر کے شام کو یا آئندہ کل واپس چلے جائیں گے، اس لئے کپڑے کے ایک ہی جوڑے میں آئے تھے، اور دوسرے جوڑے نہیں لائے تھے، لیکن حضرت حاجی صاحبؒ سے بیعت ہونے کے بعد وہیں رہ گئے، اور چالیس دن وہیں قیام کیا، اور جو کپڑے پہن کر آئے تھے، اسی

کو دھو کر دوبارہ پہن لیتے، اس طرح چالیس دن گزار دیے، چالیس دن کے بعد حضرت حاجی صاحبؒ نے ان سے فرمایا کہ:

''میاں رشید احمد! ہمیں تم کو جو کچھ دینا تھا وہ دے چکے، اب اللہ کا نام لے کر واپس جاؤ، اور وہاں جا کر اپنا کام کرو، اگر کوئی خاص حالت طاری ہو تو کسی اور سے ذکر نہ کرنا، بلکہ مجھے ہی لکھنا''

اللہ کی محبت دیدی

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس وقت حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا کہ ''میاں جو کچھ ہمیں تم کو دینا تھا وہ دیدیا'' اس وقت ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ بڑے میاں نے چالیس دن میں کیا دیدیا، بارہ سال کے بعد سمجھ میں آیا کہ کیا دیدیا، وہ یہ کہ اللہ کی محبت دیدی، اور تعلق مع اللہ پیدا کر دیا، اس صحبت کے نتیجے میں اللہ جل شانہ کی محبت اور وہ تعلق مع اللہ دل میں پیدا فرمادیا جو صلاح وفلاح کی کنجی تھی۔

اولیاء کی صحبت کی قیمت

یہ جو شعر مشہور ہے کہ:

یک زمانہ صحبت باولیاء
بہتر است از صد سالہ طاعتِ بے ریا

یعنی تھوڑی دیر کے لئے اولیاء اللہ کی صحبت کا حاصل ہوجانا یہ سو سال کی بے ریا طاعت سے بہتر ہے، بے ریا کی بھی قید لگی ہوئی ہے، یعنی طاعت بھی ہو اور

بے ریا بھی ہو، اس سے بھی بہتر وہ صحبت ہے، کسی نے اس شعر پر اعتراض کیا کہ اس کے اندر مبالغہ سے کام لیا گیا ہے، کیونکہ جو طاعت اخلاص کے ساتھ کی گئی ہو اور سو سال تک کی گئی ہو، پھر بھی ایک ساعت کی صحبت اس طاعت سے بہتر کیسے ہوگی؟

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے، بلکہ اگر شاعر ''صد لاکھ سال'' کہتا، یعنی ایک ساعت کی صحبت سو لاکھ سال کی عبادت سے بہتر ہے تو بھی مبالغہ نہ ہوتا، اس لئے اگر کوئی شخص سو لاکھ سال تک غلط رخ پر عبادت کرتا رہے، اگر چہ وہ اخلاص کے ساتھ کرتا رہے، لیکن عبادت کے اندر صرف اخلاص ہی کافی نہیں ہے، بلکہ اس عبادت کا طریقہ بھی درست ہونا چاہئے، لہٰذا اگر طریقہ صحیح نہیں تھا تو وہ سو لاکھ سال کی عبادت بے کار ہوگئی، اس کا کچھ حاصل نہیں۔

صحبت سے محبت، محبت سے نور

لہٰذا اولیاء اللہ کی صحبت سے جو چیز حاصل ہوتی ہے، وہ یہ کہ ایک تو عبادت اور طاعت کا صحیح طریقہ معلوم ہوتا ہے، اور دوسرے محبت اور تعلق مع اللہ حاصل ہوتا ہے، کیونکہ اگر کوئی شخص سو سال تک عبادت بغیر محبت کے کرے گا تو ایک طرف اس کی عبادت میں نور نہیں ہوگا، دوسرے یہ کہ وہ عبادت آسان نہیں ہوگی، لیکن صحبت کے بعد اس عبادت میں نور بھی پیدا ہو جائے گا، اور وہ عبادت آسان بھی ہو جائے گی۔ اس لئے تعلق مع اللہ پیدا کرنا ہے، جب کوئی آدمی اس طریق پر چلتا ہے تو اس کا پہلا مطلوب تعلق مع اللہ ہونا چاہئے۔

اسباب محبت اختیار میں ہیں

اب اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ اللہ کی محبت دل میں کیسے پیدا کریں؟ کیونکہ یہ محبت انسان کے اختیار میں نہیں، بلکہ یہ تو انسان کے اختیار سے باہر ہے، اس سوال کا جواب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملفوظ میں دیا ہے کہ:

> خدا کی محبت اگرچہ غیر اختیاری چیز ہے، لیکن اس کے اسباب اختیار میں ہیں، وہ یہ ہیں (۱) کثرت ذکر اللہ (۲) اللہ تعالیٰ کے انعامات کو اور اپنے برتاؤ کو سوچنا (۳) کسی اہل اللہ سے تعلق رکھنا (۴) طاعت پر مواظبت کرنا (۵) حق تعالیٰ سے دعا کرنا، اس تدبیر میں تو کوئی غلطی نہیں............

ان اسباب میں پہلا سبب یہ بیان فرمایا ''کثرت ذکر اللہ'' جب آدمی کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں خود بخود اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا ہونے لگتی ہے۔ یہ سب سے پہلا سبب ہے، آج کا ہمارا سبق یہی ہے، اس پر عمل آج ہی سے شروع کردیں، اب وقت ختم ہوگیا، باقی اسباب کے بارے میں زندگی رہی تو انشاء اللہ کل عرض کردوں گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

کثرت ذکر اللہ

محبت پیدا کرنے کا ذریعہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک
اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶
مجلس نمبر : ۸۴

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

کثرتِ ذکر اللہ

محبت پیدا کرنے کا ذریعہ

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین و العاقبۃ للمتقین و الصلوٰۃ و السلام علیٰ رسولہ الکریم و علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ أجمعین، امّابعد!

تمہید

گذشتہ کل حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ آپ حضرات کو سنایا تھا، اور اس کی تشریح شروع کی تھی، اس ملفوظ میں حضرت والا نے جو باتیں بیان فرمائی ہیں وہ سارے تصوف سارے جدوجہد کا مطلوب اور مقصود ہے۔

کیا ''تصوف'' اور ''شریعت'' الگ الگ ہیں؟

آج کل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ''تصوف'' کوئی اور چیز ہے اور ''شریعت'' کوئی اور چیز ہے، حالانکہ جس معنی کے اعتبار سے ان کو الگ الگ سمجھا جاتا ہے وہ بات درست نہیں، اس اعتبار سے تو بے شک ان دونوں کے درمیان فرق ہے کہ

''تصوف'' کے احکام کسی اور چیز سے متعلق ہیں اور ''شریعت'' کے احکام کسی اور چیز سے متعلق ہیں، لیکن یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے ''تکملہ'' ہیں، ''شریعت'' طریقت کے بغیر بے روح ہے اور ''طریقت'' شریعت کے بغیر گمراہی ہے، کیونکہ اگر کوئی شخص صرف ''تصوف'' اور ''طریقت'' کو لے کر بیٹھ جائے اور شریعت کے احکام کو نظر انداز کر دے تو زندقہ اور گمراہی ہے، اور اگر کوئی شخص شریعت کے احکام پر تو عمل کرے لیکن طریقت کے احکام کو نظر انداز کر دے اور اس کی اہمیت نہ سمجھے تو وہ شریعت بے روح ہے۔

دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم ملزوم ہیں

مثلاً ایک شخص نماز روزہ ادا کر رہا ہے جو شریعت کا حکم ہے لیکن اس نماز روزے میں اخلاص نہیں ہے، تو وہ بے جان ہے، بے روح ہے، لہٰذا شریعت اور طریقت دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم اور ملزوم ہیں، لہٰذا دونوں کو بیک وقت حاصل کرنے کی ضرورت ہے، بلکہ ''طریقت'' شریعت کے احکام میں قوت پیدا کرتی ہے۔

ایک ایک عمل کی اصلاح مشکل ہے

لیکن اگر شریعت کے تمام احکام کی ایک ایک کر کے مشق کرے اور ایک ایک کو لے کر اس کے اندر اخلاص پیدا کرے، اس کی اصلاح کرے، مثلاً پہلے نماز کو درست کرنے کی مشق کر رہا ہے، پھر روزے کی مشق کر رہا ہے، پھر زکوۃ کی، پھر حج کی مشق کر رہا ہے، پھر اپنی آنکھ کی حفاظت کی مشق کر رہا ہے، پھر اپنے کان کی

حفاظت کی مشق کر رہا ہے، اسی طرح اگر ایک ایک چیز کو لے کر اس کی مشق کرے گا تو زندگی ختم ہو جائے گی لیکن یہ فہرست ختم نہ ہوگی۔ لہٰذا ایک ایسی چیز کا حاصل کرنا ضروری ہے جس کے بعد تمام چیزوں کا حاصل کرنا آسان ہو جائے وہ چیز ''تعلق مع اللہ'' ہے۔

عقل مند باندی کا واقعہ

ہمارے حضرت والا نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک بادشاہ کا دربار لگا ہوا تھا، اس وقت بادشاہ فیاضی کے جوش میں آ گیا، اور اس نے درباریوں سے کہا کہ اس وقت دربار میں جو کچھ تمہیں نظر آ رہا ہے، سونا، چاندی، ہیرے، جواہرات، فانوس وغیرہ، میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ جو شخص جس چیز پر ہاتھ رکھ دے گا، وہ چیز اس کی ہو جائے گی، بس اعلان سنتے ہی پورے دربار میں بھگدڑ مچ گئی، کوئی سونے کی طرف بھاگ رہا ہے، کوئی چاندی کی طرف بھاگ رہا ہے، کوئی ہیرے کی طرف کوئی جواہرات کی طرف بھاگ رہا ہے، کوئی فانوس اٹھا رہا ہے، ایک باندی بادشاہ کے قریب کھڑی تھی، جب سب لوگ دوسری چیزوں کی طرف دوڑے تو اس نے جلدی سے بادشاہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا، اس باندی نے یہ سوچا کہ یہ سب بے وقوف لوگ ہیں جو سونا چاندی کی طرف بھاگ رہے ہیں، میں تو جڑ اور اصل پر ہاتھ رکھ دیتی ہوں، اگر یہ مل گیا تو پھر سونا بھی میرا، چاندی بھی میری، اور ساری نعمتیں پھر میری ہیں، بس ایک یہ مل جائے۔ بادشاہ نے اس باندی سے کہا کہ سب لوگ سونا چاندی کی طرف بھاگ رہے ہیں، تو نہیں بھاگ رہی ہے؟ اس

باندی نے کہا کہ آپ نے اعلان کیا تھا کہ جو شخص جس پر ہاتھ رکھ دے گا وہ اس کا ہو جائے گا، لہٰذا میں نے تو آپ پر ہاتھ رکھ دیا، اب آپ میرے ہو گئے، اب آپ کے پاس جو سلطنت ہے، مال و دولت ہے، جاہ ہے، عزت ہے وغیرہ ان سب میں میرا حصہ بھی ہے۔

اللہ کی محبت کے بعد سب آسان ہو جائے گا

حضرات صوفیاء کرام بھی یہی کام کرتے ہیں کہ بادشاہ کے سر پر ہاتھ رکھنا سکھاتے ہیں، وہ یہ کہ ''تعلق مع اللہ'' پیدا کرو، اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا کرلو، جب یہ پیدا کرلو گے تو سب کچھ مل جائے گا، کیونکہ ''حب اللہ'' اور ''تعلق مع اللہ'' تمام عبادات کی بنیاد ہے، اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرو، یہ چیز اگرچہ دیکھنے میں غیر اختیاری ہے، لیکن اس کے پیدا کرنے کے اسباب اختیار میں ہیں، اگر وہ اسباب اختیار کرلو گے تو انشاء اللہ وہ محبت پیدا ہو جائے گی، اس محبت کے پیدا کرنے کے بہت سے اسباب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے اس ملفوظ میں ذکر فرمائے ہیں، ان میں سے ایک ایک کے بارے میں کچھ تفصیل عرض کروں گا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ محبت اور تعلق مع اللہ کی دولت عطا فرما دے، آمین۔ ان میں سے ہر سبب کو بیک وقت اختیار کرنے کی ضرورت ہے، جب یہ تمام اسباب اختیار کئے جائیں گے تو انشاء اللہ وہ ''محبت'' ہمارے اپنے ظرف کے مطابق حاصل ہوگی، جب وہ حاصل ہو جائے گی تو سب کچھ حاصل ہو جائے گا۔

ذکر کی کثرت کا حکم

پہلی چیز جو تعلق مع اللہ اور اللہ کی محبت دل میں پیدا ہونے کا سبب بنتی ہے وہ ''کثرت ذکر اللہ'' ہے، ذکر اللہ کی جتنی کثرت ہوگی، اتنا ہی محبت میں اضافہ ہوگا، یہی وجہ ہے کہ خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

يٰاَيُّهَاالَّذِيْنَ آمَنُوْا اذْكُرُوْا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا،

اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کثرت سے کرو، اور صبح و شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کیا کرو۔

ذکر سے اللہ کا فائدہ ہے؟

اللہ تعالیٰ یہ جو فرما رہے ہیں کہ میرا ذکر کثرت سے کیا کرو، کیا اللہ تعالیٰ کو اپنا ذکر کرانے میں مزہ آتا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کو ذکر سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے؟ جس شخص کا اللہ جل شانہ پر ایمان ہے، اس کا اس پر بھی ایمان ہے کہ وہ ذات بے نیاز ہے، ساری مخلوق ساری عمر صرف اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی کرتی رہے، کوئی اور کام نہ کرے، سجدے میں پڑی رہے، تب بھی اس کی عظمت و جلال میں ذرہ برابر بھی اضافہ نہیں ہوگا، اور اگر ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر کمر باندھ لے، اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہو جائے بلکہ اللہ تعالیٰ کی شان میں _ نعوذ باللہ _ گستاخیاں بھی کرے تب بھی اس کی عظمت و جلال میں اور کبریائی میں ذرہ برابر کمی واقع نہیں ہوگی۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں : لا الہ الا اللّٰہ

یعنی جو بھی حالت ہو، لاالہ الااللّٰہ کا کلمہ اپنی جگہ پر قائم ہے، وہ ذات بے نیاز ہے۔

جامع مسجد قرطبہ

میری اندلس کی جامع مسجد قرطبہ میں حاضری ہوئی یہ مسجد کسی زمانے میں سجدہ کرنے والوں کی جبینوں سے بسی ہوئی تھی، یہ مسجد، مسجد نبوی میں جدید اضافے سے پہلے تک دنیا کی سب سے بڑی مسقّف مسجد تھی، اس مسجد میں صرف ایک رات میں شمعوں کو جلانے کے لئے سیکڑوں قنطار تیل خرچ ہوتا تھا، سارے اندلس کے لوگ وہاں آکر نمازیں ادا کرتے تھے اور سجدے کیا کرتے تھے، جو علم کا مرکز تھا، علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے بڑے بڑے علماء اس مسجد میں درس دیا کرتے تھے، سیکڑوں سال تک وہ مسجد سجدہ کرنے والوں سے آباد رہی۔

آج اس مسجد کا حال

آج جا کر دیکھو تو وہ مسجد کلیسا بنی ہوئی ہے، اور اس میں موسیقی کی آوازیں آرہی ہیں، اور ایک چھوٹی سی جگہ مسلمانوں کے لئے مخصوص کر دی گئی ہے کہ وہاں جا کر مسجد کی زیارت کر لیں، وہاں بھی نماز پڑھنے کی اجازت نہیں۔ جب میرا وہاں جانا ہوا تو میرے ایک دوست بھی ساتھ تھے، ہم نے آپس میں مشورہ کیا کہ چاہے کچھ بھی ہو، یہاں نماز ضرور پڑھیں گے، چنانچہ ہمارے دوست نے اذان دی، عصر

کی نماز کا وقت تھا، ہم نے جماعت سے عصر کی نماز ادا کرلی، جب مسجد میں جا کر ''سبحان ربی الاعلیٰ، سبحان ربی الاعلیٰ'' کی تسبیح پڑھی تو عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ میں نے کہا کہ ایک وقت وہ تھا جب یہاں ہزاروں انسان سجدے میں پڑے ہوتے تھے، اور ''سبحان ربی الاعلیٰ'' کی آوازیں گونجتی تھیں، اور اس مسجد کے میناروں سے اذانوں کی صدائیں بلند ہوتی تھیں، اس کا چپہ چپہ علم کے نور سے منور تھا۔ آج یہ حال ہے کہ جب ہم نے اذان دی تو چھپ چھپ کر ڈرتے ہوئے اذان دی کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے، اور چھپ چھپ کر نماز ادا کی، لیکن وہ ذات اُس وقت بھی ''اعلیٰ'' تھی اور اِس وقت بھی ''اعلیٰ'' ہے۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں : لا الہ الا اللّٰہ

اس کے نزدیک نہ کوئی بہار ہے، نہ کوئی خزاں ہے، جب لاکھوں انسان سجدے کر رہے تھے تب بھی وہ ''لا الہ الا اللّٰہ'' تھا، اور ''سبحان ربی الاعلیٰ'' تھا، اور آج جبکہ اس آواز پر ایک قدم بھی نہیں بڑھا، وہ آج بھی ''سبحان ربی الاعلیٰ'' ہے۔

ذکر سے ہمارا ہی فائدہ ہے

لہٰذا جب اس ذات کو ذکر کرنے والے کے ذکر سے، عبادت کرنے والے کی عبادت سے، تسبیح کرنے والے کی تسبیح سے، اس کی عظمت میں، اس کے جلال میں، اس کی کبریائی میں، اس کی صمدیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا تو پھر وہ کیوں کہہ رہے ہیں کہ مجھے کثرت سے یاد کرو، کثرت سے میرا ذکر کیا کرو، اور صبح شام ہماری

پا کی بیان کیا کرو۔ دراصل بندوں کے فائدے کے لئے یہ حکم دے رہے ہیں کہ مجھے کثرت سے یاد کیا کرو، اس لئے کہ جب بندہ کثرت سے ہم کو یاد کرے گا، اور اس کے دل میں ہماری یاد سمائے گی تو اس کو ہم سے محبت پیدا ہوگی، ہم سے اس کا تعلق قائم ہوگا، اور جب ہم سے تعلق مضبوط ہوگا تو وہ تعلق اس کو گناہوں سے بچائے گا، اس کو بدعنوانیوں سے، ظلم سے، حق تلفیوں سے بچائے گا، اور اس کو جہنم سے بچائے گا، اس لئے یہ حکم دیا جارہا ہے کہ کثرت سے ہمارا ذکر کرو۔

کثرتِ ذکر کا ایک طریقہ

اب سوال یہ ہے کہ کثرت ذکر کے لئے کیا طریقہ اختیار کریں؟ اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ صبح شام ہر وقت اللہ کا ذکر کرتے رہو، کوئی دوسرا کام ہی نہ کرو، ''اللہ اللہ'' کرو، ''سبحان اللہ سبحان اللہ'' کی تسبیح پڑھتے رہو، ''الحمدللہ الحمدللہ'' پڑھتے رہو، ''لا الہ الا اللہ'' پڑھتے رہو۔ چنانچہ پرانے زمانے میں جب لوگ بزرگوں کے پاس اپنی اصلاح کرانے کے لئے جایا کرتے تھے تو وہ بزرگ یہی طریقہ اختیار کرتے تھے کہ ان لوگوں کو ذکر کی بڑی بڑی تعداد بتا دیتے، اور ان سے کہتے کہ اور سب کام دھندے چھوڑو، بس یہ کام کرو، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس زمانے کے اللہ والوں کے جو معمولات ہوتے تھے وہ اتنے زیادہ ہوتے تھے کہ آج ہم ان کے بارے میں سن کر حیران رہ جاتے ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ کا واقعہ

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ ایک راستے سے گزر رہے تھے

کہ ان کو دیکھ کر ایک بڑھیا نے یہ کہہ دیا کہ یہ وہ شخص ہے جو عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھتا ہے، حالانکہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھنے کا آپ کا معمول نہیں تھا، بلکہ رات کو آخری شب میں اٹھ کر تہجد پڑھنے کا معمول تھا۔ لیکن اس بڑھیا کی یہ بات سن کر آپ کو غیرت آ گئی کہ ایک بڑھیا میرے بارے میں یہ حسن ظن رکھتی ہے کہ ساری رات عبادت کرتا ہوں۔ تو بس میں آج سے ایسا ہی کروں گا، چنانچہ اس دن کے بعد سے مرتے دم تک یہی معمول رہا کہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی۔ یہ درحقیقت ''اُذْکُرُوا اللّٰهَ ذِکْرًا کَثِیْرًا'' پر عمل ہو رہا تھا۔

روزانہ سوا لاکھ اسم ذات

جو حضرات اپنی اصلاح کے لئے مشائخ کے پاس جاتے تو وہ مشائخ ان کو ''اسم ذات'' کے ذکر کی تلقین کرتے کہ روزانہ سوا لاکھ مرتبہ اسم ذات پڑھنا ہے، اس زمانے میں یہ عام معمول ہوتا تھا۔

جس کو ہو جان و دل عزیز
اس کی گلی میں جائے کیوں

جب اس گلی میں آیا ہے تو اب محنت کرے۔

مدرسہ کے اہتمام کی ذمہ داری

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ دار العلوم دیوبند کے جو مہتمم تھے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، وہ بڑے منتظم قسم کے بزرگ تھے، اس زمانے میں دار العلوم دیوبند کا انتظام

چلانا آسان کام نہیں تھا، حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ وہ ایسے منتظم تھے کہ ''وزیر اعظم'' بننے کے لائق تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی انتظامی صلاحیت عطا فرمائی تھی، ہر وقت انتظام کے اندر مشغول رہتے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ کسی مدرسہ کا اہتمام بڑی خراب چیز ہے، لوگ کہتے ہیں کہ ''اہتمام'' ''ھَمّ'' سے مشتق ہے، جس کے معنی ''فکر'' کے ہیں، اس لئے کہ مہتمم ہر وقت فکر اور تشویش میں مبتلا رہتا ہے، ہر وقت گھر کے دروازے پر کوئی نہ کوئی آرہا ہے، اور گھنٹی بجا رہا ہے، ہر وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی رہتی ہے، نماز پڑھ کر مسجد سے نکلو تو گھر تک پہنچنا مشکل ہے، کوئی نہ کوئی آکر اپنا قصہ بیان کرنا شروع کر دیتا ہے، اس لئے یہ مدرسہ کا اہتمام بہت مشکل کام ہے۔

دیوبند کے مہتمم اور ذکر اللہ کی مقدار

یہ اہتمام ایسی چیز ہے کہ اس کے ساتھ دو چیزیں بہت مشکل سے چلتی ہیں، ایک تصنیف و تالیف کا کام، دوسرے ذکر اللہ، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے، لیکن روزانہ کا بلا ناغہ یہ معمول تھا کہ سوا لاکھ مرتبہ اسم ذات کا ورد کیا کرتے تھے، کبھی یہ معمول قضا نہیں ہوتا تھا، کیونکہ جب اس راستے کو اختیار کرنا ہے تو تھوڑی سے محنت کرنے پڑے گی، لہٰذا جب ذکر کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں آئے گی۔

اللہ کی رحمت کمزوروں پر بھی ہے

لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت جس طرح اقویاء پر ہے، بلند ہمت لوگوں پر ہے،

اسی طرح ہم جیسے کمزور اور کم ہمت لوگوں پر بھی ہے، اگر ہم جیسے کمزوروں کو بھی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب والانسخہ اور وظائف بتادیتے، یا اقویاء اور بلند ہمت والے لوگوں کانسخہ بتادیتے تو ہم جیسے کمزوروں کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، اس لئے ہر زمانے میں اسی مقصد کے لئے ''مجدّ د'' بھیجا جاتا ہے، وہ دین کی تجدید کرتا ہے اور مردہ سنتوں کو زندہ کرتا ہے اور لوگوں کے لئے ان کے مزاج و مذاق اور ان کی مناسبت اور ان کی صلاحیت کے مطابق نسخے تجویز کرتا ہے۔

کمزوروں والے نسخہ پر عمل کرلو

ہمارے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس فن کا مجدّد بنایا تھا، اگر وہ یہ کہتے کہ وہ مجاہدات اور ذکر کرو جو پہلے زمانے کے لوگ کیا کرتے تھے تو سب لوگ اس سے بھاگ جاتے، کوئی بھی اس راستے پر نہ آتا، اس لئے آپ نے فرمایا کہ تم لوگ کمزور ہو، اس لئے کمزوروں والا نسخہ لکھ دیتے ہیں۔

مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا بیعت کا واقعہ

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ابتداء میں تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی تھی، جب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوگیا تو والد صاحبؒ نے سوچا کہ اب کس سے تعلق قائم کریں؟ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہونے کا خیال ہو رہا تھا، مگر وہاں کے قواعد وضوابط اور مجاہدات کی وجہ سے ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ کیا کریں؟ ہمارے دادا

حضرت مولانا یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ وہ حضرت تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہم سبق تھے، میرے دادا جانؒ حضرت والد صاحبؒ کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تھانہ بھون لے گئے، وہاں جاکر والد صاحبؒ سے فرمایا کہ تم حضرت تھانوی صاحبؒ سے بیعت ہو جاؤ، والد صاحب فرماتے تھے کہ میں نے حضرت تھانوی صاحبؒ سے عرض کیا کہ حضرت! طبیعت میں بیعت ہونے کا تقاضا بھی بہت ہے اور اپنی اصلاح کی فکر بھی ہے، لیکن میں بیعت ہونے سے اس لئے ڈرتا ہوں کہ میں بہت کمزور ہمت والا ہوں، مجھ سے کچھ ہوتا نہیں ہے، نہ مجھ سے ذکر زیادہ ہوتا ہے، نہ مجھ سے عبادت زیادہ ہوتی ہے، نہ مجھ سے مجاہدے اور ریاضتیں ہوتی ہیں، اس لئے میں ڈرتا ہوں کہ اگر بیعت ہو گیا اور کام کچھ نہ کیا تو پھر بیعت ہونے کا کیا فائدہ؟

یہ دین سب کے لئے ہے

دوسرے یہ کہ میں مصروف بہت رہتا ہوں، پڑھنے پڑھانے کا معمول ہے (اس زمانے میں حضرت والد صاحبؒ اٹھارہ اٹھارہ سبق پڑھایا کرتے تھے) تدریس میں مصروف رہتا ہوں، کچھ فتوے لکھنے کا کام بھی ہے۔ حضرت تھانوی صاحبؒ نے حضرت والد صاحبؒ کی یہ باتیں سن کر فرمایا، ارے بھائی! تم کس فکر میں پڑ گئے، کیا دین صرف اقویاء کے لئے ہے، ضعفاء کے لئے نہیں ہے؟ کیا دین صرف طاقت ور لوگوں کے لئے ہے، کمزور لوگوں کے لئے نہیں ہے؟ اور یہ جو آپ فرما رہے ہیں کہ میں بہت مصروف رہتا ہوں تو کیا دین صرف فارغ لوگوں کے

لئے ہے؟ مصروف لوگوں کے لئے نہیں ہے؟ (حضرت والد صاحبؒ فرماتے ہیں
کہ حضرت والا نے یہ دو جملے ایسے فرمادئے کہ اس سے دل میں ٹھنڈک پڑگئی) ہم
آپ کو ایسا طریقہ بتائیں گے جس میں نہ تو زیادہ محنت کرنی پڑے گی اور نہ ہی زیادہ
وقت صَرف کرنا پڑے گا، البتہ ایک بات بتاتا ہوں کہ گناہوں سے بچنے کا اہتمام
کریں اور گناہوں سے بچنے کے اہتمام میں قوت کی ضرورت نہیں، صرف قوت
ارادہ کی ضرورت ہے، قوت جسمانی کی ضرورت نہیں، بلکہ گناہ کرنے کے لئے
قوت جسمانی کی ضرورت ہوتی ہے، اور گناہوں سے بچنے میں وقت بھی صرف نہیں
ہوتا، بلکہ گناہ کا ارتکاب کرنے میں وقت صرف ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ فضول
کاموں سے بچو، کیونکہ فضول کاموں سے وقت بھی ضائع ہوتا ہے اور طاقت بھی بے
کار صرف ہوتی ہے، اور اگر کچھ موقع مل جائے تو معمولات مقرر کرلو۔

ذاکر کون؟ ذکر کا وسیع مفہوم

اب یہ دیکھئے کہ پرانے حضرات صوفیاء فرماتے تھے کہ سوا لاکھ مرتبہ اسم
ذات پڑھو، اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ یہ تلقین فرمارہے ہیں کہ اگر موقع مل
جائے تو کچھ معمولات مقرر کرلو، یہ فرق ہے کیوں ہوگیا؟ بات دراصل یہ ہے کہ
کرنے کے لئے جو کام بتایا وہ ''طریق القلندری'' ہے، وہ یہ کہ چاہے زبان سے
ذکر ہو یا نہ ہو، لیکن ہر وقت اللہ تعالیٰ سے تمہارا تعلق جڑا ہوا ہو، اس لئے کہ ذکر
صرف اس کا نام نہیں کہ زبان سے ''سبحان اللہ، الحمد للہ'' پڑھ لیا، بلکہ حقیقت میں
ذکر اس کو کہتے ہیں کہ اللہ جل شانہ کو کسی بھی عنوان سے یاد کرنا، یہ ذکر ہے، مثلاً اگر

آپ شکر کر رہے ہیں تو وہ ذکر ہے، صبر کر رہے ہیں اور انا للّٰه وانا الیه راجعون پڑھ رہیں ہیں تو یہ ذکر ہے، اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگ رہے ہیں تو یہ ذکر ہے، کوئی دعا کر رہے ہیں کہ یا اللہ! میرا فلاں کام کر دیجئے، یہ ذکر ہے، یہ سب ذکر ہیں، بلکہ بزرگوں نے تو یہاں تک فرمادیا ''کل مطیع للّٰه فھو ذاکر'' جو شخص اللہ کی اطاعت کا جو کام بھی کر رہا ہے، وہ ذاکر ہے، اگر نیت صحیح کر لو، اخلاص پیدا کر لو، اپنا قبلہ درست کر لو تو جو سبق پڑھا رہے ہو وہ بھی ذکر ہے، جو مطالعہ کر رہے ہو، وہ بھی ذکر ہے، اگر کوئی شخص اللہ کی مخلوق کی خدمت کی نیت سے ڈاکٹری کر رہا ہے، وہ بھی ذکر ہے، اگر تجارت کر رہے ہو، دکان پر بیٹھے ہو اور اللہ کے لئے، اخلاص کے ساتھ، شریعت کے دائرے میں رہ کر، اپنے حقوق کی ادائیگی کی خاطر، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق تجارت کر رہے ہو، تو وہ بھی ذکر ہے، کیونکہ ''کل مطیع للّٰه فھو ذاکر'' میں داخل ہے۔

زمانہ ماضی پر استغفار کرو

چنانچہ حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ میں تمہیں چار اعمال بتاتا ہوں (حقیقت یہ ہے کہ اس سے بہتر، اس سے آسان اور اس سے مفید نسخہ کون بتائے گا) وہ یہ کہ جب ماضی کا اور گزرے ہوئے زمانے کا تصور آئے تو اس کے نتیجے میں تمہیں گناہ یاد آئیں گے کہ میں نے فلاں وقت میں یہ گناہ کیا تھا، فلاں جگہ یہ غلطی کی تھی، لہٰذا ماضی کا تصور آنے پر استغفار پڑھو اور یہ کہو ''اَستَغفِرُاللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْهِ'' اس لئے کہ اگر واقعۃً کوئی گناہ کیا تھا اور اب یاد آ رہا ہے تو اس کی

طرف سے توبہ کرنی ہی ہے، یا بعض کام اگرچہ گناہ تھے، لیکن تمہیں پتہ بھی نہیں تھا کہ یہ گناہ ہیں، اس لئے اب تک تم نے ان کی طرف سے استغفار بھی نہیں کیا تھا، لہٰذا اب ان کی طرف سے استغفار کرلو، اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے استغفار کے اندر یہ دعا فرمائی کہ:

وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ، فَإِنَّكَ تَعْلَمُ مَا لَا نَعْلَمُ

یعنی اے اللہ! ہمارے ان گناہوں کی مغفرت فرما دیجئے جو آپ کے علم میں ہیں کیونکہ بہت سے گناہ ایسے ہیں جو آپ جانتے ہیں، ہم نہیں جانتے۔ اس لئے ماضی کا تصور آنے پر استغفار کرو۔

زمانہ حال پر شکر یا صبر

جو زمانہ حال ہے، جو اس وقت گزر رہا ہے، یہ زمانہ دو حال سے خالی نہیں، یا تو اس زمانے میں کوئی ایسا واقعہ پیش آرہا ہے جس سے تمہیں راحت اور خوشی حاصل ہو رہی ہے، یا ایسا واقعہ پیش آرہا ہے جو طبیعت کے لئے ناگوار ہے اور اس پر تمہیں تکلیف ہو رہی ہے۔ اگر خوشی اور راحت کا واقعہ پیش آرہا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اور کہو ''اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ'' مثلاً اس وقت ہم آرام سے مسجد میں بیٹھے ہوئے ہیں، پنکھے چل رہے ہیں، گرمی کی تکلیف نہیں ہے، اور دین کی طلب میں اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھے ہوئے ہیں، اس پر دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرو، اور کہو اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ۔ اگر اس وقت بجلی چلی جائے، اور پنکھے بند ہو جائیں، اور گرمی کی تکلیف ہو جائے تو اس پر صبر کرو، اور کہو

''اِنَّـا لِلّٰه وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ'' بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کلمات کسی کے مرنے پر ہی پڑھے جاتے ہیں، یہ خیال غلط ہے، بلکہ ہر تکلیف پہنچنے پر اور ناگواری کا واقعہ پیش آنے پر ''اِنَّالِلّٰه وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھو، اور یہ دعا کرو یا اللہ! اس پریشانی کو دور فرمادیں، اس گرمی کو دور فرمادیں۔

دل ہی دل میں شکر

بہر حال! حال کے زمانے میں یا تو کوئی خوشگوار حالت پیش آرہی ہوگی یا ناخوشگوار حالت پیش آرہی ہوگی، اگر خوشگوار حالت ہے تو اس پر دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، زبان سے بھی شکر ادا کرلیں تو بہت اچھا ہے، '' اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ'' ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب تم نے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کردیا تو جانے تم نے کیا سے کیا کردیا، اس لئے کہ کسی کو پتہ نہیں کہ اندر ہی اندر تم نے کیا عبادت انجام دیدی۔ کیونکہ اگر تم وضو کرکے دو رکعت نفل ادا کرو گے تو ہزاروں لوگ تمہیں دیکھ لیں گے، جس کی وجہ سے ریا کا بھی اندیشہ ہے، اور نام ونمود کا خطرہ بھی ہے، لیکن یہاں تو جب دل ہی دل میں یہ کہہ دیا کہ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ تو تم کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

میانِ عاشق و معشوق رمزیست
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

''شکر''، عظیم عبادت ہے

یہ شکر کی عبادت کوئی معمولی عبادت ہے؟ یہ تو اتنی بڑی عبادت ہے کہ حدیث شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الطَّاعِمُ الشَّاكِرُ بِمَنْزِلَةِ الصَّائِمِ الصَّابِرِ

یعنی جو آدمی کھانا کھا کر شکر ادا کرے، اس کو اتنا اجر ملے گا جتنا روزہ رکھ کر صبر کرنے والے کو ملتا ہے۔ اور یہ شکر ایسی عبادت ہے جو انسان کو شیطان کے حملوں سے بچاتی ہے، لہٰذا باریک سے باریک اور چھوٹی سے چھوٹی نعمت جس کی طرف آدمی کا دھیان بھی نہیں جاتا، اس کی طرف دھیان لے جاؤ، اور پھر اس پر شکر ادا کرو۔

ناشکری کے کلمات مت نکالو

اللہ تعالیٰ بچائے (آمین) بعض لوگوں کی ایسی طبیعت ہوتی ہے کہ ہمیشہ برائی کی طرف ان کا دھیان جاتا ہے مثلاً کسی واقعہ کے دو پہلو ہیں، تو تاریک پہلو کی طرف ان کا دھیان جائے گا، اچھے پہلو کی طرف ان کا دھیان نہیں جائے گا، چنانچہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جب ان سے پوچھا جائے کہ کیسے مزاج ہیں؟ تو جواب میں کچھ نہ کچھ خرابی ضرور بتائیں گے، ورنہ پہلے یہ ہوتا تھا کہ جب بھی کسی مسلمان کی خیریت پوچھی جاتی تو وہ جواب میں کہتا کہ ''اللہ کا شکر ہے، الحمد للہ'' لیکن آج کل اچھے بھلے چلتے پھرتے انسان سے پوچھا جائے کہ کیا حال ہے؟ تو جواب

میں کہتے ہیں کہ کیا بتاؤں، کیسی گزر رہی ہے، بعض لوگ یہ جواب دیتے ہیں کہ ''ٹائم پاس ہو رہا ہے'' جس کا مطلب یہ ہے کہ میں تکلیف اور مصیبتوں کا شکار ہوں، بس میری ہمت ہے کہ میں وقت گزار رہا ہوں اور ٹائم پاس کر رہا ہوں، اس کے جواب کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تکلیف دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ العیاذ باللہ العظیم۔ یہ میرا ہی حوصلہ ہے کہ میں ٹائم پاس کر رہا ہوں۔ ایسی ناشکری کے کلمات زبان سے نکالتے ہیں، خدا کے لئے ان کلمات سے بچو، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار کرو۔

شکر کی عادت ڈالو اور نعمتوں کا دھیان کرو

ہر آن اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی جو بارش ہے اور جو اَن گنت اور بے شمار نعمتیں ہر وقت حاصل ہیں، ان کے سامنے اس ذرا سی تکلیف کی کوئی حقیقت نہیں، آج ہم ان نعمتوں کو تو نہیں دیکھتے، اور ذرا سی تکلیف آجائے تو اس پر شور مچانا شروع کر دیتے ہیں، لہٰذا اُن نعمتوں پر شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو، جب شکر کی عادت پڑ جائے گی تو پھر نعمتوں کی طرف نظر جانے لگے گی کہ کون سی چیز ایسی ہے جس پر میں شکر ادا کروں، جب سوچنے کی عادت پڑ جائے گی، اور نعمتوں کی طرف نظر جانے لگے گی تو اس وقت یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ:

وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ لَا تُحۡصُوۡهَا

یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو گے تو شمار نہیں کر سکو گے، لہٰذا نعمتوں کا تصور کرکے اور سامنے رکھ کر ان کی طرف سے شکر ادا کرو۔ بہر حال! زمانہ

حال کے اندر شکر ادا کرنا ہے، یا صبر کرنا ہے۔

تکلیف شاذ و نادر ہی آتی ہے

ہمیشہ اس بات کی کوشش کرو کہ "شکر" "صبر" پر غالب رہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں تکلیف دہ امور پر غالب ہیں، تکلیف دہ امور تو شاذ و نادر کبھی پیش آجاتے ہیں، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ

اس آیت میں "وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِالْخَوْفِ" نہیں فرمایا، بلکہ "بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ" تنوین تنکیر کے ساتھ لائے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم تمہیں تھوڑا سا خوف دے کر آزمائیں گے، تھوڑی سی بھوک دے کر، اور تمہارے اموال میں، تمہاری جانوں اور ثمرات میں تھوڑی سی کمی کر کے آزمائیں گے، اور پھر اس آزمائش پر صبر کرنے والوں کو اتنی بڑی بشارت عطا فرمادی۔

"شکر" صبر پر غالب رہنا چاہئے

لہٰذا تکلیف دہ امور تو تھوڑے سے ہیں، زیادہ تر نعمتیں ہی نعمتیں ہیں، نعمتیں ہی غالب ہیں، لہٰذا شکر صبر پر غالب ہونا چاہئے، وہ اس طرح کہ تمہاری زبان اکثر و بیشتر اللہ کے شکر سے تر رہے، تمہارے دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر جاگزیں رہے، چلتے، پھرتے، اٹھتے، بیٹھتے شکر جاری رہے، مثلاً کہیں جانا چاہتے تھے، سواری آرام دہ مل گئی، کہو: اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، گاڑی میں بیٹھنے کی جگہ مل گئی، کہو:

اَللّٰھُمَّ لَکَ الحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، منظر اچھا سامنے نظر آرہا ہے، کہو: اَللّٰھُمَّ لَکَ الحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، ہوا کا جھونکا آیا، اچھا لگا، کہو: اَللّٰھُمَّ لَکَ الحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، گھر میں داخل ہوئے، بچہ کو کھیلتا دیکھ کر خوشی ہوئی، کہو: اَللّٰھُمَّ لَکَ الحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، کھانا سامنے آیا، کہو: اَللّٰھُمَّ لَکَ الحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، بھوک لگ رہی ہے، کہو: اَللّٰھُمَّ لَکَ الحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، کھانا ذائقہ دار ہے، کہو: اَللّٰھُمَّ لَکَ الحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ۔ ہر وقت زبان سے ان کلمات شکر کی رٹ لگاؤ۔ اب بتاؤ، کیا ان الفاظ کو ادا کرنے میں کوئی محنت ہو رہی ہے؟ کیا کوئی مشقت ہو رہی ہے؟ کیا زیادہ وقت صرف ہو رہا ہے؟ نہ زیادہ محنت صرف ہو رہی ہے، نہ زیادہ وقت صرف ہو رہا ہے، لیکن زبان سے مسلسل ذکر جاری ہے، اور کسی کو پتہ بھی نہیں کہ یہ بندہ اللہ کا ذکر کر رہا ہے، جس ذات کو پتہ لگنا چاہئے بس اس ذات کو پتہ ہے کہ میرا بندہ میرا شکر ادا کر رہا ہے، میرا ذکر کر رہا ہے اور جس وقت یہ ذکر کر رہا ہے تو ہر ذکر کے وقت اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم ہو رہا ہے۔

''تعلق مع اللہ'' حاصل ہو رہا ہے

اور جب ایک بندہ ہر لمحے یا تو نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کر رہا ہے یا مصائب پر صبر کر رہا ہے یا اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہا ہے تو اس کے نتیجے میں اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط ہو رہا ہے اور اسی مضبوط تعلق کا نام ''تعلق مع اللہ'' ہے۔

وہ تو دل میں ہی مل گئے

حضرت مجذوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک شعر میں فرماتے ہیں کہ:

وہ اتنے تھے قریب کہ دل ہی میں مل گئے
میں جا رہا تھا دور کا ساماں کئے ہوئے

یعنی میں تو کبھی اِدھر بھاگ رہا تھا اور کبھی اُدھر بھاگ رہا تھا، لیکن جب صاحبِ نظر نے راستہ دکھا دیا، اور یہ بتا دیا کہ اتنی دور جانے کی ضرورت نہیں، وہ تو اپنے دل ہی میں مل گئے۔ لہٰذا جب تم ہر وقت شکر ادا کر رہے ہو، اور ہر وقت دعا کر رہے ہو، اور ہر وقت ان کے ساتھ رابطہ قائم ہے، تو وہ دل ہی میں مل گئے، یہ تو زمانہ حال میں کرنے کا کام تھا۔

مستقبل کے بارے میں پناہ مانگو

اب باقی رہا مستقبل کا مسئلہ۔ تو مستقبل کے بارے میں انسان کے دل میں اندیشے پیدا ہوتے رہتے ہیں کہ کہیں یہ نہ ہو جائے، وہ نہ ہو جائے، کہیں کاروبار میں نقصان نہ ہو جائے، میرا امتحان قریب ہے، کہیں امتحان میں فیل نہ ہو جاؤں، اب میں فارغ ہو رہا ہوں، فارغ ہونے کے بعد پتہ نہیں کہیں ملازمت ملے گی یا نہیں؟ کہیں پریشانی میں مبتلا نہ ہو جاؤں، کسی سے قرض نہ لینا پڑ جائے، اس قسم کے ہزاروں اندیشے دل میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، ان کا علاج یہ ہے کہ جب دل میں کوئی اندیشہ پیدا ہو، اس وقت کہو ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ'' اے اللہ میرے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہو رہا ہے، میں اس اندیشے سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں اور میں نے اپنے کو آپ کے حوالے کرتا ہوں۔ اس طرح ہر اندیشہ پر اللہ سے پناہ مانگو۔

وہ بندہ ذاکرین میں سے ہے

اب جو بندہ ہر لمحے ماضی پر استغفار کررہا ہے اور حال پر کبھی شکر ادا کر رہا ہے، کبھی صبر کررہا ہے اور مستقبل پر اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگ رہا ہے تو اس بندے کا تو کوئی لمحہ اللہ کے ذکر سے خالی ہی نہیں ہے، وہ تو ہر وقت اللہ کے ذکر میں لگا ہوا ہے، اسی کا نام ذکر قلبی ہے اور اس کے ذریعے وہ ''تعلق مع اللہ'' جو بڑی بڑی ریاضتوں اور بڑے بڑے مجاہدات کے بعد حاصل ہوتا تھا، آسانی کے ساتھ حاصل ہو جائے گا، بس اس کو اختیار کرنے کی دیر ہے، بہر حال یہ ''کثرت ذکر اللہ'' کا ایک آسان اور مفید اور انتہائی مؤثر طریقہ ہے، جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملفوظ میں بتا دیا۔

نعمتوں کو سوچا کرو

لیکن کوئی بھی کام محض کہنے سے نہیں ہوتا، بلکہ اس کام کی مشق کرنی پڑتی ہے، اس کی عادت ڈالنی پڑتی ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرنے کی عادت ڈالو۔ مثلاً جیسے اس وقت ہم یہاں بیٹھے ہیں، اس وقت ہمیں اللہ تعالیٰ کی کون کون سی نعمتیں حاصل ہیں؟ اس طرف ہمارا ذہن نہیں جاتا، لیکن سوچ سوچ کر یاد کرو کہ سر سے لے کر پاؤں تک ہمیں کیا کیا نعمتیں اس وقت میسر ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کی کثرت کا پہلا قدم ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو ذکر کی کثرت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

ادعیہ ماثورہ

کثرت ذکر اللہ کا بہترین طریقہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک

اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶

مجلس نمبر : ۸۵

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

ادعیہ مأثورہ

کثرتِ ذکر اللہ کا بہترین طریقہ

الحمد للّٰہ رب العٰلمین، و العاقبة للمتقین، و الصلوٰة و السلام علی رسوله الکریم، و علی آله و اصحابه اجمعین، أما بعد!

تمہید

گذشتہ دو روز سے یہ بات چل رہی تھی کہ سارے طریقت، تصوف اور سلوک کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی محبت دل میں جاگزیں ہو جائے، اور اللہ جل شانہ کے ساتھ تعلق اتنا مضبوط ہو جائے کہ ہر وقت اللہ جل شانہ کا دھیان رہے۔ اگر یہ چیز حاصل ہو جائے تو دین کے سارے احکام پر عمل آسان ہو جائے۔

اصطلاحات کی فکر میں مت پڑو

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اصطلاحات کی فکر میں مت پڑو، چنانچہ تصوف میں بہت سی اصطلاحات ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے

ساتھ اس درجہ کا تعلق قائم ہو جائے تو اس کا یہ نام ہے، اس سے زیادہ ہو جائے تو اس کا یہ نام ہے، سب سے آخری اور انتہائی درجہ کو "ملکہء یادداشت" کہتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وقت دل میں اللہ جل شانہ کا دھیان رہے۔ لیکن حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اصطلاحات کی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں، بہت سے لوگ اس فکر میں رہتے ہیں کہ ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس وقت میں جس حالت سے گزر رہا ہوں، یہ حالت کس قسم کی ہے؟ اور اس کا کیا نام ہے؟ حضرت والا فرماتے تھے کہ تمہیں آم کھانے کی فکر ہونی چاہئے، پیڑ گننے سے کیا مطلب؟ اگر تمہیں وہ چیز حاصل ہو رہی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ جیسے ایک آدمی ریل گاڑی کے ذریعے لاہور جا رہا ہے، اب سفر کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہر اسٹیشن کا نام یاد کرے کہ فلاں فلاں اسٹیشن راستے میں آئے، فلاں فلاں اسٹیشن پر گاڑی رکی، اور ایک طریقہ یہ ہے کہ پڑا سوتا رہے، صبح جب بیدار ہوگا تو انشاء اللہ لاہور پہنچ جائے گا۔ اگر اس سے پوچھا جائے کہ راستے میں کون کون سے اسٹیشن آئے تو وہ اسٹیشن کے نام تو نہیں بتا سکتا، لیکن لاہور پہنچ گیا۔

اصل مقصد اللہ کی یاد کا دل میں بس جانا

اسی طرح تصوف وسلوک کی اصطلاحات کی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں، لیکن تصوف کا حاصل یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد دل میں بس جائے، اللہ جل شانہ کی محبت دل میں قائم ہو جائے، اور تعلق مضبوط ہو جائے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

اس ملفوظ میں اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کے اسباب بتلا رہے تھے، پہلا سبب بیان فرمایا "کثرت ذکر اللہ" یعنی اللہ جل شانہ کے ذکر کی کثرت، اس کا بیان گذشتہ کل شروع کیا تھا۔

ادعیہ مأثورہ کا اہتمام کریں

کثرت "ذکر اللہ" کا مقصد جن طریقوں سے حاصل ہوتا ہے، ان میں سے ایک طریقہ "ادعیہ مأثورہ" کا اہتمام ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عجیب طریقہ تلقین فرمایا، وہ یہ کہ صبح سے لے کر شام تک کی زندگی میں ہم جن مراحل سے گزرتے ہیں، ان میں سے ہر ہر مرحلے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعا تجویز فرمادی کہ جب صبح کو سو کر بیدار ہو تو یہ دعا پڑھو، جب غسل خانے میں داخل ہونے لگو تو یہ دعا پڑھو اور جب باہر نکلو تو یہ دعا پڑھو، جب وضو کرنا شروع کرو تو یہ دعا پڑھو، جب وضو سے فارغ ہو جاؤ تو یہ دعا پڑھو، مسجد میں داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھو، مسجد سے باہر نکلتے وقت یہ دعا پڑھو، کھانا سامنے آئے تو یہ دعا پڑھو، کھانے سے فارغ ہو جاؤ تو یہ دعا پڑھو، جب دستر خوان اٹھاؤ تو یہ دعا پڑھو، وغیرہ، اس طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مراحل میں مختلف دعائیں تجویز فرمادیں۔

ان دعاؤں کو معمولی مت سمجھو

لوگ ان دعاؤں کے پڑھنے کو معمولی سمجھتے ہیں کہ کسی موقع پر دعا پڑھ لی تو کیا نہیں پڑھی تو کیا! خاص طور پر مولوی صاحبان یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دعائیں پڑھنا مستحب ہے، اور مستحب کی تعریف یہ ہے کہ پڑھو تو ثواب، نہ پڑھو تو کوئی گناہ نہیں۔

لہٰذا دعائیں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ چنانچہ وہ دعائیں پڑھنے کا اہتمام نہیں کرتے، حالانکہ ہر موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مانگی ہوئی دعا کو مانگنا اتنی عجیب وغریب چیز ہے کہ اس کے منافع اور فوائد کی کوئی حد ونہایت ہی نہیں۔

یہ الہامی دعائیں ہیں

اوّل تو ان میں سے ایک ایک دعا ایسی ہے کہ اگر ان میں سے ایک دعا بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شرف قبول پالے تو ہمارا بیڑا پار ہو جائے، اس کے علاوہ یہ کہ ان دعاؤں کے الفاظ میں نور ہے، ان کے معنی میں نور ہے، ان کے فوائد میں نور ہے، گویا کہ ان دعاؤں میں نور ہی نور بھرا ہوا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ دعائیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے "دلائل النبوۃ" میں سے ہیں، کسی انسان کے بس میں نہیں تھا کہ وہ ایسی چیزیں اللہ تعالیٰ سے مانگے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم مانگنا سکھا گئے، اور جن الفاظ سے مانگنا سکھا گئے، وہ حاجتیں جو ہمارے اور آپ کے تصور میں نہیں آسکتیں، ایسی حاجتیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم مانگ گئے، دنیا وآخرت کی کوئی بہتری ایسی نہیں جو ان دعاؤں کے اندر موجود نہ ہو۔ اس لئے میں تو کہتا ہوں کہ یہ دعائیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ''دلائل النبوۃ'' میں سے ہیں، کیونکہ یہ دعائیں ایسی ہیں کہ انسان وحی کی روشنی کے بغیر نہیں مانگ سکتا، ایسے ایسے جامع کلمات ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، میرا دل چاہتا تھا کہ ان دعاؤں کی شرح کی جائے، چنانچہ جامع مسجد بیت المکرّم کے جمعہ کے بیانات میں ان دعاؤں کی تشریح شروع کی ہے، اللہ تعالیٰ آسانی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچا دے۔ آمین، (اب

الحمدللہ وہ تشریح مکمل ہو چکی ہے اور تحریر میں بھی آ چکی ہے اور اصلاحی خطبات کی جلد (۱۳) انہی دعاؤں کی تشریحات پر مشتمل ہے۔ مرتب)

ہر کام کے وقت اللہ سے تعلق

یہ دعائیں اپنے پیچھے معنی کی بڑی کائنات رکھتی ہیں، لہٰذا ایک طرف تو یہ دعائیں بڑی مؤثر ہیں، دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے مختلف مراحل پر یہ دعائیں تجویز فرمادیں۔ اس لئے کہ اگر تم ایک مرتبہ بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا چاہو گے تو کتنا ذکر کرو گے؟ ہزار مرتبہ، پانچ ہزار مرتبہ، یا زیادہ سے زیادہ دس ہزار مرتبہ کرلو گے، لیکن فارغ ہونے کے بعد پھر اپنے کاموں میں مشغول ہو کر غافل ہو جاؤ گے، ہم تمہیں ذکر کا ایسا طریقہ بتا دیتے ہیں کہ تم جس کام میں لگے ہوئے ہو، اس کام کے اندر ہی تمہارا ذکر کا مقصد حاصل ہو رہا ہے، یہاں تک کہ اگر تم بیت الخلاء جارہے ہو، وہاں بھی ذکر کا مقصد حاصل ہو رہا ہے، اگر وہاں سے نکل رہے ہو تو بھی ذکر کا مقصد حاصل ہو رہا ہے، گویا کہ ہر کام میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر کی فضیلت عطا کی جارہی ہے، اور تمہارا تعلق اللہ تعالیٰ سے جوڑا جارہا ہے۔

خدائی پاور ہاؤس سے تعلق جڑ جائے گا

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ تمہارے گھر کے اندر بجلی آرہی ہے، تم نے جیسے ہی بٹن دبایا، تمہارے گھر کا تعلق پاور ہاؤس سے جڑ گیا، اور پاور ہاؤس سے یہاں تک بجلی آنے میں بے شمار تار ہیں، بے شمار کھمبے ہیں، بے شمار ٹرانسفارمر ہیں، ان کے ذریعے سینکڑوں میل سے بجلی تمہارے

گھر میں آرہی ہے، جیسے ہی تم نے سوئچ آن کیا، اس بجلی نے سینکڑوں میل کا فاصلہ طے کرلیا، اور تمہارا تعلق پاور ہاؤس سے جڑ گیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ادعیہ مأثورہ تلقین فرما کر گویا کہ یوں فرمادیا کہ بار بار اپنا سوئچ آن کرتے رہو اور جس جس وقت تم ان دعاؤں کا سوئچ آن کروگے، تمہارا تعلق خدائی پاور ہاؤس سے جڑتا رہے گا۔

اللہ کا دروازہ بار بار کھٹکھٹاؤ

دنیا کے دوسرے تعلقات کا تو یہ حال ہے کہ اگر تمہارا کسی سے تعلق ہو جائے اور تم اس کو بار بار پکارو، بار بار اس کے گھر جا کر اس کے دروازے پر دستک دو، تو وہ ایک مرتبہ برداشت کرلے گا، دو مرتبہ برداشت کرلے گا، تین مرتبہ برداشت کرلے گا، چوتھی مرتبہ دستک دینے پر پٹائی کرے گا، یا مثلاً آپ نے کسی کو ایک مرتبہ ٹیلیفون کیا، تھوڑی دیر بعد دوبارہ ٹیلیفون کیا، تو وہ اس سے ناراض اور غصہ ہو جائے گا کہ بار بار مجھے فون پر پریشان کر رہا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھ سے جتنی مرتبہ چاہو، تعلق قائم کرلو، اور جس وقت چاہو، جس لمحے چاہو، جس کام کے لئے چاہو، تعلق قائم کرلو، میرے پاس آجاؤ، میرا دروازہ کھٹکھٹاؤ، اور مجھ سے تعلق قائم کرنے کے لئے سوئچ آن کرتے رہو۔ یہ ادعیہ مأثورہ دراصل اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق جوڑ رہی ہیں، اور جتنی مرتبہ دعا کروگے، اتنا ہی اس تعلق میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، اتنی ہی اللہ تعالیٰ سے محبت بڑھے گی، لہٰذا یہ ادعیہ مأثورہ معمولی چیز نہیں، ان کو خوب یاد کرو، اور بروقت ان دعاؤں کے پڑھنے کی عادت ڈالو۔

زندگی کے ہر موڑ کے لئے دعائیں موجود ہیں

مسنون دعاؤں کی بے شمار کتابیں چھپی ہوئی ہیں، مناجات مقبول ہے، حصن حصین ہے، میں نے بھی ایک رسالہ "پُر نور دعائیں" کے نام سے لکھا ہے، جس میں ساری دعائیں جمع کردی ہیں، ان کتابوں کو پڑھو، اور دیکھو کہ کہاں کہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا دعائیں مانگی ہیں، اگر کوئی شخص ان دعاؤں کے پڑھنے کی پابندی کرلے تو صبح سے لے کر شام تک کی زندگی کا کوئی موڑ ایسا نہیں ہے جس میں وہ اپنے اللہ سے رجوع نہ کر رہا ہو، اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرنے کا ایک نایاب طریقہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تلقین فرمادیا۔

زباں بھی ذاکر اور تعلق بھی قائم

تجربہ یہ ہے کہ جو شخص ان دعاؤں کے پڑھنے کا عادی بن جاتا ہے، اس کا تعلق بھی اللہ تعالیٰ سے جڑ جاتا ہے، البتہ بعد میں ایسا لگتا ہے کہ چونکہ الفاظ یاد ہو گئے ہیں اور پڑھنے کی عادت ہوگئی ہے، اس لئے اس دعا کو پڑھتے وقت معنی اور مفہوم کی طرف دھیان نہیں رہتا۔ اس وجہ سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح دعا پڑھنے سے کیا فائدہ؟ آٹومیٹک مشین چل پڑی، اور زبان سے خود بخود الفاظ ادا ہو گئے، حالانکہ دل کہیں ہے، اور دماغ کہیں ہے، اس لئے اس طرح دعا پڑھنا بے فائدہ ہے۔ یہ خیال غلط ہے، کیونکہ اس طرح دعا پڑھنا بھی فائدہ سے خالی نہیں، کم از کم تمہاری زبان تو اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہے، تمہارا ایک عضو تو اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگا ہوا ہے، اس لئے یہ بھی کوئی کم نعمت نہیں، لیکن اگر ان دعاؤں کو ان کے

معنی کی طرف دھیان کر کے توجہ سے پڑھو گے تو اس کے نتیجے میں جو فائدہ ہوگا، اور جو تعلق مع اللہ حاصل ہوگا، وہ عظیم الشان ہے۔ بہر حال، یہ ادعیہ ماثورہ کا پڑھنا کثرت ذکر اللہ کا دوسرا طریقہ ہے۔

ہر وقت مانگتے رہو

کثرت ذکر اللہ کا تیسرا طریقہ "کثرت دعا" ہے، یعنی اللہ تعالیٰ سے مانگنے کی کثرت، کثرتِ دعا کی اتنی مشق کی جائے کہ ہر وقت تمہارا دل اللہ تعالیٰ سے کچھ نہ کچھ مانگ رہا ہو، چاہے زبان پر دعا ہو یا نہ ہو، لیکن دل میں اللہ تعالیٰ سے کچھ نہ کچھ مانگ رہا ہو، مثلاً چلتے، پھرتے، اٹھتے، بیٹھتے کام میں لگے ہوئے مانگتے رہو، اب سوال یہ ہے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے کیا چیز مانگیں؟

انسان حاجتوں کا پتلہ

اگر غور کر کے دیکھو تو یہ نظر آئے گا کہ انسان حاجتوں کا پتلہ ہے، ہر لمحہ اس کو کوئی نہ کوئی حاجت اور ضرورت ہے، کوئی لمحہ اس کا احتیاج سے خالی نہیں، مثلاً اس وقت ہم یہاں مسجد میں بیٹھے ہوئے ہیں، بظاہر تو کوئی حاجت نہیں، لیکن بے شمار حاجتیں اس وقت بھی ہمارے ساتھ لگی ہوئی ہیں، مثلاً اگر گرمی لگ رہی ہے تو پنکھے اور ہوا کی حاجت ہے، اگر دھوپ آرہی ہے تو سائے کی حاجت ہے، اگر سردی زیادہ لگ رہی ہے تو گرمائش کی حاجت ہے، کیونکہ انسان کو کسی ایک حال پر قرار نہیں، ذرا سی ٹھنڈ زیادہ ہو جائے تو پریشان ہو جاتا ہے، اگر گرمی زیادہ ہو جائے تو پریشان ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہر وقت اس کو کوئی نہ کوئی حاجت ہے، لہٰذا ہر ہر لمحے جو

حاجتیں تم کو پیش آ رہی ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہو۔

اس طرح مانگو

مثلاً اگر گرمی لگ رہی ہے تو یہ کہو یا اللہ! گرمی دور فرما دیجئے، اگر سردی لگ رہی ہے تو کہو: یا اللہ! یہ سردی دور فرما دیجئے، کسی آدمی کی تلاش ہے، دعا کرو کہ: یا اللہ! فلاں آدمی سے ملاقات ہو جائے، کہیں جانا ہے، اور بس کے انتظار میں اسٹاپ پر کھڑے ہو، کہو: یا اللہ! آسانی سے بس مل جائے، ٹیکسی کی تلاش ہے، کہو: یا اللہ! آسانی سے ٹیکسی مل جائے، جب سواری میں بیٹھ گئے، کہو: یا اللہ! سگنل کھلا مل جائے، یا اللہ! ٹریفک جام نہ ہو۔ لہٰذا جو حاجت جس وقت پیش آ رہی ہے، اسی وقت وہ حاجت اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک فرمایا کہ اگر تمہارے جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو۔

یقینی طور پر حاصل ہونے والی چیز بھی اللہ سے مانگو

ایک اور باریک بات جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی، وہ یہ کہ جو چیز آنکھوں سے نظر آ رہی ہے کہ یہ چیز یقینی طور پر ابھی مجھے حاصل ہونے والی ہے، وہ بھی اللہ سے مانگو۔ مثلاً آپ روزہ افطار کرنے بیٹھے، سامنے دسترخوان پر افطاری کا سامان موجود ہے، اب بظاہر یہ بات یقینی ہے کہ ہاتھ بڑھا کر افطاری کھا لیں گے۔ حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ اس وقت بھی اللہ سے مانگو کہ: یا اللہ! مجھے یہ چیز کھانی نصیب ہو جائے، اور اس چیز کی لذت مجھے عطا فرما دیجئے، اس کے ذریعے مجھے طاقت اور صحت عطا فرما دیجئے، اور اس کے ذریعے

مجھے بدہضمی نہ ہو، میرا پیٹ خراب نہ ہو، بلکہ صحت و عافیت کے ساتھ مجھے کھلا دیجئے۔

اعلیٰ درجہ کا "توکل" یہ ہے

اللہ تعالیٰ نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو عجیب علوم عطا فرمائے تھے، انسان کی عقل حیران رہ جاتی ہے، فرماتے ہیں کہ جہاں آدمی کے سامنے اسباب موجود نہیں ہیں، اگر اس جگہ پر "توکل" کیا تو یہ کوئی بڑی بات نہیں، کیونکہ وہاں اسباب موجود ہی نہیں، اور "توکل" کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ "توکل" کا مزہ تو اس جگہ پر ہے جہاں اسباب سو فیصد موجود ہیں، جیسے ابھی میں نے مثال دی کہ کھانا سامنے موجود ہے، کھانے کے لئے صرف ہاتھ بڑھانے کی دیر ہے، اس موقع پر بھی نظر ان اسباب پر نہ ہو، بلکہ اس وقت بھی نظر مسبب الاسباب پر ہو، اور اس وقت یہ کہو کہ: اے اللہ! یہ کھانا سامنے موجود تو ہے، لیکن تیری توفیق کے بغیر نہ میں کھا سکتا ہوں اور نہ ہی اس کھانے سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں، یہ "توکل" اعلیٰ درجے کا ہے، کیونکہ سو فیصد اسباب موجود ہونے کے باوجود نگاہ ان اسباب کی طرف نہیں ہے۔ اس "توکل" کی بھی مشق کرنی چاہئے۔

اسباب کی موجودگی میں "توکل" کی ضرورت کیوں؟

تمام اسباب موجود ہونے کے موقع پر "توکل" کی ضرورت اس لئے ہے کہ بے شمار واقعات ایسے ہوئے ہیں کہ سو فیصد اسباب موجود ہونے کے باوجود اور کھانا سامنے ہونے کے باوجود وہ کھانا منہ تک نہیں پہنچ سکا، مثلاً یہ کہ عین اس وقت کسی

بیاری کا حملہ ہوگیا، فالج ہوگیا، موت واقع ہوگئی، بے ہوشی طاری ہوگئی، تو اب وہ کھانا تو سامنے موجود ہے، لیکن کھانے کی توفیق نہیں ہوئی۔

کھانا الگ نعمت، کھلانا الگ نعمت

کھانے کے بعد جو دعا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائی ہے، اس کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ رَزَقَنَا وَ اَطْعَمَنَا وَ سَقَانَا وَ جَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ "میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اس میں دو الفاظ الگ الگ ارشاد فرمائے ہیں، ایک "رَزَقَنَا" اور دوسرا "اَطْعَمَنَا" یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہمیں غذا عطا فرمائی، ہمیں رزق دیا، اور ہمیں کھلایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ رزق دینا الگ نعمت ہے اور رزق کھلانا الگ نعمت ہے، کیونکہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ رزق کی نعمت تو موجود ہوتی، لیکن معدہ خراب ہوتا، بدہضمی ہورہی ہوتی، تو اس صورت میں "رَزَقَنَا" تو ہے، لیکن "اَطْعَمَنَا" نہیں ہے، کیونکہ کھلانے کی نعمت حاصل نہیں ہوئی۔ ایسے واقعات زندگی میں بہت پیش آتے ہیں کہ چیز تو موجود ہے، لیکن اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ یہ موقع اللہ تعالیٰ پر "توکل" اور بھروسا کرنے کا ہے کہ اے اللہ! آپ کی مشیت پر اس سے فائدہ اٹھانا موقوف ہے، آپ کی مشیت ہوگی تو میں اس سے فائدہ اٹھاؤں گا، آپ کی مشیت نہیں ہوگی تو فائدہ نہیں اٹھاسکوں گا، لہٰذا میں آپ سے یہ دعا کرتا ہوں کہ آپ مجھے یہ چیز کھلا بھی دیجئے، اور اس کا نفع بھی پہنچا دیجئے۔

مانگنے سے محبوب بن جاؤ گے

بہر حال، انسان حاجتوں کا پتلا ہے، جو بھی حاجت پیش آئے وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے پیش کرے۔ اور دعا کی قبولیت کے جو اوقات ہیں، نمازوں کے بعد اور دوسرے اوقات میں، ان اوقات میں ذرا اہتمام کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ لو۔ دنیا کے اندر تو یہ معاملہ ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی سخی داتا ہو، اگر تم اس کے پاس جا کر ایک مرتبہ مانگو گے، دیدے گا، دوسری مرتبہ بھی دیدے گا، تیسری مرتبہ بھی دیدے گا، اس کے بعد مانگو گے تو اس شخص کو تمہارے چہرے سے نفرت ہو جائے گی کہ یہ شخص اب مانگنے کے لئے پھر آ گیا ہے۔ لیکن اللہ جل شانہ کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے، تو یہ اصول ہے کہ "من لم یسئل اللّٰه یغضب علیه" یعنی جو شخص اللہ سے نہیں مانگتا، اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم سے جب چاہو، مانگو، جتنا چاہو، مانگو، جتنی مرتبہ چاہو، مانگو، اور تم جتنا زیادہ مانگو گے، اتنا ہی تم ہمارے یہاں محبوب ہو گے، اگر نہیں مانگو گے تو ہم ناراض ہوں گے کہ تم نے کیوں نہیں مانگا۔ لہٰذا ہر وقت اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہو، منگتے بنے رہو، یہ ایسا دربار ہے تو اس دربار سے فائدہ اٹھاؤ، اور مانگو، اور دعا کرو۔ اس دعا کی کثرت کا فائدہ یہ ہو رہا ہے کہ اس کے نتیجے میں اللہ جل شانہ کے ساتھ تعلق مضبوط ہو رہا ہے، اور کثرت ذکر کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔

عجیب وغریب دعا

بہر حال، کثرت ذکر کے تین طریقے ہوئے، ایک یہ کہ ان چار اعمال کا

اہتمام کرنا (جن کا بیان گذشتہ مجلس میں تفصیل سے ہو چکا) دوسرے یہ کہ "ادعیہ ماثورہ" پڑھنے کا اہتمام کرنا، تیسرے یہ کہ "دعا کی کثرت" کرنا۔ یہاں تک کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری دعائیں کرلیں، اور دنیا و آخرت کی کوئی حاجت نہیں چھوڑی تو آخر میں پھر ایک عجیب و غریب دعا فرمائی، وہ یہ کہ:

اَیُّمَا عَبْدٍ اَوْ اَمَةٍ مِنْ اَھْلِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَقَبَّلْتَ
دَعْوَتَھُمْ وَ اسْتَجَبْتَ دُعَائَھُمْ، فَاِنَّا نَسْئَلُكَ
اَنْ تُشْرِكَنَا فِیْ صَالِحِ مَا یَدْعُوْنَكَ فِیْهِ، وَاَنْ
تُشْرِكَھُمْ فِیْ صَالِحِ مَا نَدْعُوْكَ فِیْهِ وَاَنْ
تُعَافِیَنَا وَاِیَّاھُمْ وَاَنْ تَجَاوَزَ عَنَّا وَ عَنْھُمْ۔

یہ ایسی عجیب دعا ہے کہ کسی دوسرے انسان کے تصور میں بھی یہ الفاظ نہیں آسکتے، فرمایا کہ اے اللہ! خشکی اور سمندر میں آپ کے کسی بندے نے اور کسی بندی نے ساری زندگی میں جو بھی دعا مانگی ہو، اے اللہ! ہمیں بھی اس دعا میں شامل کر لیجئے، اور اُن کو ہماری دعاؤں میں شامل کر لیجئے، اور اُن کی مغفرت فرما دیجئے، اور ہماری بھی مغفرت فرما دیجئے۔

دل دل میں مانگ لو

اور صرف زبان سے نہیں، بلکہ دل دل میں ذکر کرتے رہو، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ الحمد للہ، کبھی اس سے تخلف نہیں ہوتا کہ ایک شخص آیا، اور اس نے کہا کہ حضرت! ایک مسئلہ پوچھنا ہے، اسی وقت فوراً اللہ تعالیٰ سے یہ دعا

کرلیتا ہوں کہ یا اللہ! یہ شخص پتہ نہیں کیا سوال کرے گا، اس کا صحیح جواب میرے دل میں ڈال دیجئے، اس طرح دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم ہے۔ لہٰذا جو آدمی ماضی پر استغفار کررہا ہے، حال میں صبر کررہا ہے یا شکر کررہا ہے، اور مستقبل کے لئے استعاذہ کررہا ہے، اور مختلف مراحل زندگی میں ادعیہ ماثورہ کا پابند ہے، اور اس کا دل ہر وقت اللہ تعالیٰ سے کچھ نہ کچھ مانگ رہا ہے، اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ضرور قائم ہو جائے گا، لہٰذا کثرت ذکر اللہ، اللہ تعالیٰ کی محبت اور تعلق قائم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

ان تسبیحات کا معمول بنالو

پھر ہمارے بزرگوں نے یہ بھی فرمادیا کہ چوبیس گھنٹوں میں سے تھوڑا وقت ایسا مخصوص کرلو جس میں ذکر ہی مقصود ہو، اور بہتر یہ ہے کہ فجر سے پہلے کا وقت یا فجر کے بعد کا متصل وقت اس کے لئے مخصوص کرلو، لیکن اگر اس وقت عذر ہو تو دوسرے اوقات میں کوئی وقت ذکر کے لئے مختص کرلو، اور اس وقت میں یکسوئی کے ساتھ اللہ کا ذکر کرو، تلاوت کرو، تسبیحات پڑھو، مثلاً "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ" ایک تسبیح "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ" کی ایک تسبیح اور استغفار کی ایک تسبیح، درود شریف کی ایک تسبیح، اور لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ کی ایک تسبیح، اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ کی ایک تسبیح۔ ان اذکار کے پڑھنے کا اہتمام کرو، ان سب اذکار کی ایک ایک تسبیح پڑھنے کا معمول بنالو، اگر زیادہ

وقت نہیں تو ایک تہائی تسبیح کا معمول بنالو، اور ۳۳-۳۳ مرتبہ تمام اذکار پڑھ لیا کرو، لیکن جب ذکر کے لئے وقت مقرر کرلو تو پھر اس وقت کو اسی کام میں صَرف کرو، اور پہلے یہ دیکھو کہ میں چوبیس گھنٹے میں سے کتنا وقت اس کام کے لئے نکال سکتا ہوں، پھر اس کے حساب سے معمولات مقرر کرلو، چاہے آدھا گھنٹہ ہو یا پندرہ منٹ ہوں، یا دس منٹ ہوں، لیکن پھر اس کی پابندی کرو، اور اس وقت کے اعتبار سے اذکار کی تعداد میں کمی کرلو، اگر اس وقت میں سو کی تعداد پوری نہیں ہوتی تو ٦٦ کی تعداد مقرر کرلو، ٦٦ کی تعداد پوری نہیں ہوتی تو ۳۳ کی تعداد مقرر کرلو، ۳۳ کی تعداد پوری نہیں ہوتی تو ۱۱ کی تعداد مقرر کرلو۔

پابندی والا عمل پسندیدہ ہے

لیکن جو مقرر کرو پھر اس کی پابندی بھی کرو، ایک حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

قلیل تدوم علیه ارجی من کثیر مملول

یعنی وہ تھوڑا سا عمل جس پر تم مداومت کرو، اس میں اللہ تعالیٰ یہاں اجر وثواب اور قبولیت کی زیادہ امید ہے بنسبت اس کثیر عمل کے جس کو آج کیا اور کل چھوڑ دیا، ایک اور حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

خیر العمل مادیم علیه و ان قلّ

یعنی "بہترین عمل وہ ہے جس پر مداومت کی جائے اگر چہ وہ تھوڑا ہو" مداومت کے اندر برکت ہوتی ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ اذکار کا وقت بھی مقرر ہو،

اور جگہ بھی مقرر ہو، اور تعداد بھی مقرر ہو، کیونکہ ایک جگہ پر بیٹھ کر جب آدمی ذکر کرتا ہے تو اس کا فائدہ بھی زیادہ ہوتا ہے، بنسبت اس کے کہ آدمی چلتے پھرتے ذکر کرے، جگہ اور وقت مقرر کرنے میں زیادہ فائدہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس ذکر کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس زمان و مکان کو ذکر اللہ کے نور سے منور کر دیتے ہیں۔

کائنات کی ہر چیز کا ذکر کرنا

یہ جو قرآن کریم میں ہے کہ:

اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ (سورۂ ص:۱۸)

یعنی جب حضرت داؤد علیہ السلام ذکر کرتے تھے تو ان کے ساتھ پہاڑ بھی ذکر کرتے تھے، اور پرندے بھی ذکر کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے اس چیز کو انعام کے طور پر ذکر فرمایا کہ حضرت داؤد علیہ السلام پر ہمارا یہ انعام تھا جب وہ ذکر کرتے تو ان کے ساتھ پہاڑ بھی ذکر و تسبیح کیا کرتے تھے۔

ذکر میں دلجمعی پیدا ہوتی ہے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پہاڑ ذکر و تسبیح کرتے تھے تو حضرت داؤد علیہ السلام پر کیا احسان اور انعام ہوا؟ اگر وہ تسبیح کر رہے ہیں تو کرنے دو، ان کا حضرت داؤد علیہ السلام سے کیا تعلق؟ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ پہاڑوں کا ذکر کرنا حضرت داؤد علیہ السلام پر انعام اس طرح ہے کہ جب ذاکر ذکر کرتا ہے، اور اس کے ساتھ کائنات کے دوسرے عناصر بھی ذکر کرنے میں مشغول ہوتے ہیں تو اس کے ذکر میں دلجمعی اور لطف زیادہ پیدا

ہوتا ہے۔

ذکر کے وقت یہ تصور کیا کرو

اسی وجہ سے صوفیاء کرام نے ذکر کا ایک طریقہ ایسا تجویز فرمایا ہے جس میں ذاکر ذکر کرتے وقت یہ تصور کرتا ہے کہ میرے ساتھ پوری کائنات ذکر کر رہی ہے، یہ چاند بھی ذکر کر رہا ہے، یہ سورج بھی ذکر کر رہا ہے، یہ آسمان بھی ذکر کر رہا ہے، یہ پہاڑ وغیرہ سب میرے ساتھ ذکر کر رہے ہیں، اس تصور کا بڑا عظیم فائدہ خود ذاکر کو محسوس ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جب آدمی ذکر کے لئے کوئی جگہ اور وقت مقرر کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ذکر سے اس جگہ اور وقت کو منور فرما دیتے ہیں، اور اب وہ وقت اور جگہ بھی اس کے ساتھ ذکر میں شریک ہو جاتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں ایک دوسرے کے ذکر کی برکت کا انعکاس ایک دوسرے پر ہوتا ہے، اس لئے ایک جگہ اور ایک وقت مقرر کر کے ذکر کرنے میں زیادہ فائدہ ہے، اگرچہ تھوڑی دیر کے لئے کرو، مگر پابندی سے کرو۔

خلاصہ

بہرحال؛ کثرت ذکر کا چوتھا طریقہ یہ ہے کہ تھوڑا سا وقت مقرر کر کے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرو، اگر یہ کام کر لیا تو انشاء اللہ کثرت ذکر کا مقصود حاصل ہوگا، اور اس کے نتیجے میں اللہ جل شانہ کے ساتھ محبت پیدا ہوگی، اور تعلق مضبوط ہوگا، اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو بھی اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

اللہ کی نعمتوں کا مراقبہ کریں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۰، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک
اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶
مجلس نمبر : ۸۶

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

اللہ کی نعمتوں کا مراقبہ کریں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۔أَمَّا بَعْدُ !

تمہید

پچھلے کئی روز سے حضرت والا کے ایک ملفوظ کا بیان چل رہا ہے، جس کا موضوع یہ ہے کہ دین پر چلنے کا جب کوئی شخص ارادہ کرے تو اس کے لئے اس کو کچھ محنت کرنی پڑتی ہے، اس ''محنت'' کو حضرات صوفیاء کرام ''مجاہدہ'' اور ''ریاضت'' کہتے ہیں، لیکن ان تمام مجاہدات اور ریاضتوں کا جو اصل مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کے ساتھ مضبوط تعلق قائم ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں سما جائے، جب یہ تعلق قائم اور مضبوط ہو جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں سما جاتی ہے تو پھر دین کے تمام احکام پر عمل آسان ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ''محبت'' کے نتیجے میں مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہو جاتے ہیں، لہٰذا اصل چیز یہ ہے کہ کسی طرح اللہ تعالیٰ کی محبت مطلوب درجے میں پیدا ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس مطلوب

درجے میں تعلق قائم ہو جائے، جب یہ چیز حاصل ہو جاتی ہے تو باقی سارے کام خود بخود ہوتے رہتے ہیں۔

بیویوں کے درمیان مساوات

حضرت والا فرمارہے ہیں کہ ویسے تو محبت غیر اختیاری چیز ہے، کسی سے محبت ہے، کسی سے محبت نہیں ہے، یا ایک سے محبت زیادہ ہے، اور دوسرے سے محبت کم ہے، چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کے درمیان ہر طرح سے مثالی مساوات قائم فرمائی، اور ہر ایک کے ساتھ برابری کا سلوک فرمایا، لیکن اس سب کے باوجود آپ نے یہ دعا فرمائی کہ:

اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِيْ فِيْمَا اَمْلِكُ ، وَلَا تَلُمْنِيْ فِيْمَا لَا اَمْلِكُ

اے اللہ! جو میں نے تقسیم کیا ہے وہ اپنے اختیاری معاملات میں تقسیم کیا ہے کہ جتنے پیسے ایک بیوی کو دیے، اتنے ہی پیسے دوسری بیویوں کو دیے، جیسا کھانا ایک بیوی کو دیا، ویسا ہی کھانا دوسری بیویوں کو دیا، جیسے کپڑے ایک بیوی کو دیے، ویسے ہی کپڑے دوسری بیویوں کو دیے، جیسا برتاؤ ایک بیوی کے ساتھ کیا، ویسا ہی برتاؤ دوسری بیویوں کے ساتھ کیا، لہٰذا اختیاری معاملات میں تو میں نے "عدل" اور مساوات کی کوشش کرلی، لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں جو میرے اختیار میں نہیں ہیں، اے اللہ! ان غیر اختیاری چیزوں پر مجھ سے مؤاخذہ مت فرمایئے گا۔

محبت اختیار میں نہیں

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا چیز آپ کے اختیار میں نہیں تھی؟ حضرات علماء

کرام نے اس کی تشریح میں فرمایا کہ وہ "محبت" ہے کہ یہ اختیار میں نہیں کہ تمام ازواج مطہرات سے محبت بھی برابر ہو، بلکہ محبت کسی سے زیادہ ہے، اور کسی سے کم ہے۔ یہ چیز انسان کے اختیار سے باہر ہے، انسان وہ پیمانہ کہاں سے لائے، جس سے وہ یہ ناپے کہ میں جتنی محبت اس سے کرتا ہوں، دوسرے سے بھی اتنی محبت کروں۔ اس سے معلوم ہوا کہ "محبت" انسان کے اختیار میں نہیں، اور جب اختیار میں نہیں تو سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ محبت کس طرح قائم ہو؟ اس کے جواب میں حضرت والا فرما رہے ہیں کہ اگرچہ "محبت" اختیار میں نہیں، لیکن اس کے "اسباب" اختیار میں ہیں، جب ان اسباب کو اختیار کرو گے تو وہ "محبت" دل میں پیدا ہوگی، اس ملفوظ میں حضرت والا ان "اسباب" کو بیان فرما رہے ہیں، ان میں سے پہلا سبب یہ بیان فرمایا کہ "کثرت ذکر اللہ" جتنا انسان اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے گا اتنی ہی اللہ تعالیٰ کی محبت اس کے دل میں پیدا ہوگی، اور "کثرت ذکر اللہ" کے کچھ طریقے میں نے بتائے تھے کہ ادعیہ ماثورہ کا اہتمام کرے، اور دعا کی کثرت کرے، اور ہر چیز اللہ تعالیٰ سے مانگے، اور تھوڑا سا وقت مخصوص کر کے اس میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کا اہتمام کرے، ان سب کا بیان تفصیل سے ہو گیا۔

اللہ کے انعامات اور اپنے برتاؤ کو سوچنا

آگے حضرت والا "محبت" پیدا ہونے کا دوسرا "سبب" بیان فرما رہے ہیں، چنانچہ فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ کے انعامات کو اور اپنے برتاؤ کو سوچنا" اس میں حضرت والا نے دو چیزیں بیان فرمائیں، ایک یہ کی اللہ تعالیٰ کے انعامات کو سوچنا، دوسری

یہ کہ پھر اپنے برتاؤ کو سوچنا، ان دونوں چیزوں کو سوچنا اللہ تعالیٰ کی ''محبت'' پیدا کرنے کے لئے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط کرنے کے لئے بڑا اکسیر ہے، ہر وقت ہم پر اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں مبذول ہیں، ہر وقت نعمتوں کی جو بارش برس رہی ہے، اس کا دھیان کرو، اس کو سوچو، ان نعمتوں کا ''مراقبہ'' کرو، ''مراقبہ'' اور ''دھیان'' کرنے سے سمجھ میں آئے گا، اس کے بغیر سمجھ میں بھی نہیں آئے گا۔

نعمتوں کا مراقبہ اور دھیان کرو

انسان صبح سے شام تک اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں پل رہا ہے، ہر ہر فرد بشر پر ہر آن اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور نعمتوں کی بارش ہو رہی ہے، لیکن اس طرف دھیان اور خیال بھی نہیں جاتا کہ یہ بھی کوئی نعمت ہے جو ہمیں حاصل ہے، اس کے نتیجے میں انسان غفلت کا شکار رہتا ہے، لیکن جب انسان اہتمام اور دھیان کے ساتھ ان نعمتوں کی طرف توجہ کرتا ہے تو پھر ان نعمتوں کا استحضار ہو جاتا ہے، اور ان کی طرف نگاہ جانے لگتی ہے، اور اس بات کا احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں، جو مجھے ہر وقت ہر آن حاصل ہیں۔

اللہ والوں کی صحبت سے دھیان اور استحضار حاصل ہوتا ہے

یہ دھیان اور احساس اور استحضار اس وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان کسی اللہ والے کی صحبت میں بیٹھتا ہے، جب تک اللہ والے کی صحبت نصیب نہیں تھی تو اس وقت تو غفلت میں وقت گزر رہا تھا، اس وقت اس طرف دھیان ہی نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کیا کیا نعمتیں میری طرف مبذول ہیں، بلکہ ہر وقت کسی نہ کسی مصیبت کو لے

کر روتا ہی رہتا تھا، ذرا سی کوئی تکلیف آ گئی، ذرا سی پریشانی آ گئی تو بس اسی کو لئے بیٹھا ہے، اس کو لے کر رو رہا ہے۔ لیکن جب اللہ جل شانہ کسی اللہ والے کے ساتھ تعلق قائم فرما دیتے ہیں، اور انسان کسی اللہ والے کا دامن پکڑ لیتا ہے تو پھر یہ فہم اور سمجھ آتی ہے کہ ارے تو کس ذرا سی مصیبت کو لے کر بیٹھا تھا، تیرے اوپر تو صبح سے لے کر شام تک اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بارش برس رہی ہے۔

قرآن کریم میں تدبر اور تفکر کی دعوت

اور قرآن کریم بھی تمہیں یہی دعوت دے رہا ہے کہ ذرا سوچا کرو، ذرا غور و فکر کیا کرو، جگہ جگہ قرآن کریم میں تدبر اور تفکر کا حکم دیا گیا ہے، اب لوگ اس تدبر اور تفکر کا غلط مطلب سمجھ بیٹھے، چنانچہ آج کل لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم بار بار تدبر اور تفکر کی دعوت دے رہا ہے، اس کا مطلب یہ کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں خوب ترقی کرو، یہ مطلب درست نہیں۔ ویسے تو سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کرنا کوئی بری بات نہیں، بلکہ جائز اور مستحب ہے، اور بعض حالات میں واجب ہے۔ لیکن قرآن کریم نے جس تدبر اور تفکر کی دعوت دی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں، بلکہ قرآن کریم کے تدبر اور تفکر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی نعمتوں کا، اور اس کی تخلیق کی حکمتوں کا، اور اس کی قدرت کاملہ کا، اور کی حکمت بالغہ کا انسان دھیان کرے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو تہجد کے لئے بیدار ہوتے تو آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتے، اور یہ آیت کریمہ تلاوت کرتے:

إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ
الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيَاتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ
يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ
وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

یعنی ان آسمانوں کی تخلیق میں، اور زمینوں کی تخلیق میں، اور دن رات کے آنے جانے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں، عقل والے کون لوگ ہیں؟ اس کی تفصیل آگے اللہ تعالیٰ نے خود فرمادی کہ عقل والے وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں کھڑے ہونے کی حالت میں، اور بیٹھنے کی حالت میں، اور لیٹنے کی حالت میں، اور وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! آپ نے یہ آسمان، زمین، یہ ستارے اور کائنات کی تمام اشیاء بے فائدہ پیدا نہیں کیں، بلکہ ہمارے فائدے کے لئے اور ہماری مصلحت کے لئے پیدا فرمائی ہیں، ان میں سے ہر چیز ہمارے لئے ایک نعمت ہے، اے اللہ! جب آپ نے اس دنیا میں ہمیں یہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں تو اے پروردگار! ہمیں اپنی رحمت سے جہنم کے عذاب سے بھی نجات عطا فرما۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کے وقت یہ آیات تلاوت کیا کرتے تھے۔

یہ زمین میرے لئے، یہ آسمان میرے لئے

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک نظم ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں کہ:

یہ زمیں میرے لئے، یہ آسماں میرے لئے

چل رہا ہے دیر سے یہ کارواں میرے لئے

یہ سب کارواں اللہ تعالیٰ نے میرے لئے پیدا فرمایا ہے، یعنی میری مصلحت کے لئے، میرے فائدے کے لئے۔ اگر غور کرو گے تو یہ نظر آئے گا کہ یہ سورج تمہاری خدمت کر رہا ہے، یہ چاند تمہاری خدمت کر رہا ہے، یہ ستارے تمہاری خدمت کر رہے ہیں، یہ ہوائیں تمہاری خدمت کر رہی ہیں، یہ سمندر، یہ دریا، یہ پہاڑ، یہ جنگل، غرض ہر چیز تمہارے لئے ہی اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے، چنانچہ فرمایا:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا

یعنی جو کچھ اس نے زمین میں پیدا کیا ہے، وہ تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔

یہ سورج میرے لئے ہے

روزانہ صبح کے وقت سورج نکلتا ہے، اور اپنی کرنیں پھیلاتا ہے، اور دھوپ ڈالتا ہے، اور شام کو غروب ہوتا ہے، یہ سب کیوں؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے انسان! یہ سورج جو اتنی بڑی مخلوق ہے، یہ میں نے تیرے لئے پیدا کی ہے، تاکہ تجھے روشنی حاصل ہو، تجھے گرمی حاصل ہو، اور اس کی روشنی میں تو اپنی زندگی کے مقاصد پورے کرے، اور اس سورج کو اتنے فاصلے پر رکھا کہ اس کا فائدہ تو تمہیں حاصل ہو جائے، لیکن اس کے نقصان سے تم محفوظ رہو۔ پھر اس سورج کی کرنوں میں مفید اجزاء بھی ہیں، اور مضر اجزاء بھی ہیں، اب مضر اجزاء سے انسان کو بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے پوری دنیا کے اردگرد ایک ''چھلنی'' لگادی ہے، جس کو آج کل ''اوزون'' ozone کہا جاتا ہے، یہ چھلنی بڑی مہین اور لطیف ہے، اس چھلنی سے

سورج کی کرنیں چھن کر اس کے صرف مفید اجزاء انسان تک پہنچتے ہیں، اور مضر اجزاء روک دیئے جاتے ہیں، آج کے دور میں مدتوں کے بعد، صدیوں کے بعد یہ ''اوزون'' دریافت ہوا، ورنہ انسان کو پتہ بھی نہیں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی پیدائش کے وقت ہی وہ چھلنی لگادی تھی، ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ ہمارے فائدے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں کیا کچھ نظام مقرر فرما رکھا ہے، ایک ایک چیز کی ماہیت اور حقیقت پر غور کرو گے تو یہ نظر آئے گا کہ صرف ایک چیز کے اندر اللہ تعالیٰ کی لاکھوں نعمتیں موجود ہیں۔

اپنے جسم کے اندر غور کرلو

یہ تو ''آفاق'' کی باتیں ہیں، ارے تم جسم پر غور کرلو، سر سے لے کر پاؤں تک، اور بال سے لے کر ناخن تک، تمہارے جسم کا ایک ایک حصہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ، اس کی حکمت بالغہ، اس کی رحمت واسعہ کا کرشمہ ہے، تمہیں تو بھی پتہ نہیں کہ تمہارے جسم میں کیا ہو رہا ہے، آج تک تم اپنے جسم کو بھی پوری طرح دریافت نہیں کر سکے، تمہارے جسم کا کون سا حصہ کیا عمل کر رہا ہے؟ جب سے انسان نے سوچنا شروع کیا، اس وقت سے لے کر آج تک اپنے وجود کی تحقیق میں مصروف ہے، چنانچہ طب اور میڈیکل سائنس کا شعبہ اسی تحقیق میں مصروف ہے کہ اس چھ فٹ کے وجود میں اللہ تعالیٰ نے کیا کارخانہ لگا رکھا ہے، لیکن آج تک یہ کارخانہ کلی طور پر دریافت نہیں ہو سکا، اور جو کچھ دریافت ہوا، اس سے پتہ چلا کہ یہ عجیب و غریب کارخانہ ہے، دنیا کا کوئی کارخانہ، کوئی فیکٹری، کوئی مل ایسی عجیب و غریب

نہیں ہے، جیسے انسان کے جسم کی فیکٹری ہے، جو اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے، انسان اس فیکٹری کو اِدھر سے اُدھر لئے پھر رہا ہے، اس کو استعمال کر رہا ہے، اس کے ایک ایک عضو سے فائدہ اٹھا رہا ہے، لیکن خود اس کو پتہ نہیں کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔

بھوک کب لگتی ہے؟

انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ مجھے بھوک لگ رہی ہے، پھر بھوک مٹانے کے لئے کھانا کھا رہا ہے، ذائقہ اور لذت حاصل کرنے کے لئے کھانا کھا رہا ہے، اس بیوقوف کو یہ پتہ نہیں کہ اس وقت اس سرکاری مشین کو تیل کی ضرورت ہے، اس کو ایندھن کی ضرورت ہے، یہ تیل کب ختم ہو رہا ہے، اور کتنا باقی ہے؟ اس کو جاننے کے لئے کوئی میٹر تو لگا ہوا نہیں ہے، گاڑی کے اندر تو تم نے میٹر لگا دیا ہے، جس سے پتہ چل جاتا ہے کہ اب اس گاڑی کا پیٹرول ختم ہونے والا ہے، اس لئے اس میں پیٹرول ڈلوادو۔ اس جسم کے اندر اللہ تعالیٰ نے اتنا مزیدار میٹر لگا دیا ہے کہ جب اس جسم کو ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کو بھوک لگ جاتی ہے، خود بخود کھانا کھانے کو دل چاہتا ہے۔ یہ بیوقوف انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ میں بھوک مٹانے کے لئے کھانا کھا رہا ہوں، اور لذت حاصل کرنے کے لئے کھانا کھا رہا ہوں۔

"ذائقہ" ایک عظیم نعمت

پھر اللہ تعالیٰ نے اس منہ کے اندر ایک ذائقہ رکھ دیا، تاکہ اس ذائقے کو حاصل کرنے کے لئے خود انسان کھانے کی طرف مائل ہو، اور اس ذائقے کی تسکین کے لئے کھانا کھائے، اب یہ انسان سمجھ رہا ہے کہ میں ذائقے کی تسکین کے لئے

کھانا کھارہا ہوں، لیکن حقیقت میں اس کے جسم کو ''غذا'' کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ ذائقہ تمہاری چھوٹی سی زبان میں رکھ دیا، اگر یہ مزیدار کھانا تم ناک میں رکھ لو، یا جسم کے کسی اور حصہ میں لگاؤ تو کیا کوئی ذائقہ محسوس ہوگا؟ کیا یہ پتہ چلے گا کہ یہ کھٹا ہے یا میٹھا ہے؟ کچھ بھی نہیں، لیکن اس چھوٹی سی زبان میں اللہ تعالیٰ نے ایسے لعاب پیدا فرمادئے، کہ اس لعاب کے نتیجے میں ذائقہ معلوم ہوتا ہے، اور کھانے میں مزہ آتا ہے، اگر وہ ذائقہ خراب ہو جائے تو اچھی خاصی میٹھی چیز بھی کڑوی معلوم ہوتی ہے۔

اگر یہ ''ذائقہ'' خراب ہو جائے تو

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ مجھے شاید نزلہ ہو گیا تھا، اس کے نتیجے میں ذائقہ بالکل رخصت ہو گیا، چنانچہ میں ایک جگہ دعوت میں گیا، کسی نے مجھے مرچوں والا قیمہ لاکر دیا، اور اس کے بعد میٹھی کھیر لا کر دی، میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ قیمہ کھانے میں اور کھیر کھانے میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا تھا، نہ مرچیں محسوس ہوئیں، اور نہ مٹھاس محسوس ہوئی، بس ویسے ہی حلق سے اتار لیا۔ عام حالات میں اللہ تعالیٰ نے اس زبان کے اندر ایسا ذائقہ رکھ دیا کہ کھانے میں لذت آرہی ہے، مزہ آرہا ہے، اسی ذائقے کے حصول کی خاطر انسان متنوع اور مختلف قسم کی اشیاء بنا رہا ہے، ایک بڑی مخلوق صرف تمہارے اس ذائقے کی تسکین کے لئے لگی ہوئی ہے، اور اشیاء میں چٹخارہ پیدا کرنے کے لئے لگی ہوئی ہے، اب آدمی تو یہ سمجھ رہا ہے کہ میں چٹخارے کی تسکین کر رہا ہوں، حقیقت میں اس کے نتیجے میں اس کے بدن کو غذا مل

رہی ہے، اس کے بدن کو ایندھن مل رہا ہے۔

''معدہ'' میں خود کار مشین لگی ہوئی ہے

اور پھر تم نے تو ذائقہ حاصل کرنے کی خاطر ہر چیز کو منہ میں ڈال کر اس کو حلق سے اتار لیا، افطار کے وقت دیکھیں کہ آپ کیا کرتے ہیں، ابھی میٹھی چیز کھائی، ابھی کھٹی چیز کھائی، اب پھلکیاں کھالیں، اب پکوڑے کھالئے، اب کھجور کھالی، الم غلم سب کچھ اندر بھر لیا، اس کی کوئی فکر نہیں کی کہ اندر کیا ہوگا؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہارے جسم کے اندر ایک کارخانہ لگا دیا ہے، جو ہر ہر چیز کو الگ کر رہا ہے، اور چھانٹی کر رہا ہے، یہ میرا بندہ اپنے ذائقے کے حصول کے لئے الم غلم سب کچھ کھا گیا ہے، اس لئے ہم نے اندر ایک خود کار مشین لگا دی ہے، جو ہر چیز کو الگ کر رہی ہے، جس چیز سے خون بننا چاہئے، اس سے خون بن رہا ہے، جس چیز سے جسم کو توانائی ملنی چاہئے، اس سے توانائی مل رہی ہے، جو فضلہ اور بے کار ہے، وہ خارج ہو رہا ہے، ایک طرف سے غذا آرہی ہے، اور دوسری طرف سے خارج ہو رہی ہے، ایک مکمل نظام قائم ہے، جو اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے۔

بغیر طلب کے یہ سب کچھ دیدیا

اگر اس نظام کی ایک کل ذرا سی ڈھیلی ہو جائے تو آدمی بے چین اور پریشان ہو جاتا ہے، اس کی حالت خراب ہو جاتی ہے، اور اب ڈاکٹروں کے پیچھے پھر رہا ہے۔ کیا تم نے اللہ میاں سے کہا تھا کہ ہم کھانا کھائیں گے تو اس کھانے کے نظام کو ٹھیک کر دیجئے گا؟ ہمارے جسم کے اندر ایسا جگر بنا دیجئے گا، ایسا گردہ اور ایسا معدہ

بنا دیجئے گا، کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے ان چیزوں کے بنانے کی فرمائش کی تھی؟ نہیں، بلکہ اسی نے محض اپنی رحمت سے اپنے فضل وکرم سے یہ سارا کارخانہ تمہارے لئے بنا دیا، اسی کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

مانبودیم و تقاضہ مانبود
لطف او ناگفتہء ما می شنود

یعنی نہ ہم موجود تھے، اور نہ ہماری طرف سے کوئی فرمائش اور تقاضا تھا، اسی کے کرم نے ہماری وہ بات سن لی جو ہم نے کہی نہیں تھی۔ ہماری نہ کہی ہوئی بات سن کر ہمارے لئے یہ کارخانہ بنا دیا۔

''آنکھیں'' عظیم نعمت ہیں

یہ ایسا عجیب وغریب کارخانہ ہے کہ دنیا کا کوئی کارخانہ اس کی نظیر نہیں ہے، نہ اس کی نظیر مل سکتی ہے، اگر کوئی انسان یہ کارخانہ بنانا چاہے تو اربوں کھربوں میں بھی یہ کارخانہ نہیں بن سکتا۔ اب جو صاحب نظر ہے وہ ان نعمتوں کو دیکھتا ہے، ان کا استحضار کرتا ہے، ان کے بارے میں وہ سوچتا ہے کہ یا اللہ! آپ نے ہمیں یہ آنکھ عطا فرمائی ہے کہ جب سے ہم پیدا ہوئے ہیں، اس وقت سے لے کر آج تک حسین مناظر اس آنکھ سے دیکھ رہے ہیں، اور اس آنکھ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، کبھی تمہارے ذھن میں اس کے نعمت ہونے کا خیال آیا؟ کبھی تم نے اس نعمت کا شکر ادا کیا؟ اور یہ کہا یا اللہ! آپ نے یہ آنکھ دی، اس میں بینائی اور روشنی عطا کی، ہم نے شکر نہیں ادا کیا، بلکہ غفلت کے عالم میں اس عظیم نعمت کو استعمال کر رہے ہیں، بے

پروائی کے عالم میں اس کو استعمال کر رہے ہیں۔ ہاں! خدا نہ کرے کبھی یہ بینائی چلی جائے، یا اس میں کمی واقع ہو جائے، تب پتہ چلے گا کہ یہ کتنی بڑی نعمت تھی جو ہم سے چھن گئی، لیکن اس وقت لاپروائی سے استعمال کر رہے ہیں، پھر اس کے استعمال میں حلال وحرام سب ایک کر رکھا ہے۔ لہٰذا کبھی سوچا کرو کہ یہ آنکھ کتنی بڑی نعمت ہے، کیا ہمارے بس میں تھا کہ ایسی بینائی والی چیز کسی طرح حاصل کر لیتے؟ جب چلی جاتی ہے تو لاکھوں کروڑوں خرچ کرنے کے بعد بھی واپس نہیں آتی، اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کے لئے دو پہرے دار بٹھا دیئے، یہ دو پلکیں پہرے دار ہیں، جب کوئی چیز آنکھ کی طرف آتی ہے تو یہ پلکیں اس کو روک لیتی ہیں، تاکہ براہ راست آنکھ پر ضرب نہ لگے، اس لئے کہ یہ آنکھیں اتنی نازک ہیں کہ اگر ذرا سی بھی کوئی چیز لگ جائے گی تو خراب ہو جائیں گی، ایسی نعمت کے بارے میں بیٹھ کر غور کیا کرو، سوچا کرو، اور اس پر شکر ادا کیا کرو۔

''کان'' اور ''زبان'' عظیم نعمتیں ہیں

یہ کان اللہ تعالیٰ کی کتنی عظیم نعمت ہے، ان لوگوں سے اس کی قدر پوچھو جو سننے کی قوت سے محروم ہیں، یہ زبان اور قوت گویائی عطا فرمائی، اپنے دل کی بات کہنے کا ذریعہ عطا فرمایا، ورنہ تمہارے دل میں جذبات اُمڈتے رہتے، اور زبان سے کچھ نہ کہہ سکتے، اس کی قدر ان لوگوں سے پوچھو جن کی زبان پر فالج گر جاتا ہے، وہ لوگ کوئی بات کہنا چاہتے ہیں، اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، لیکن اظہار نہیں کر پاتے۔ آپ کو یہ نعمت اللہ تعالیٰ نے مفت میں عطا فرما رکھی ہے، بہر

حال! سر سے لے کر پاؤں تک اپنے وجود ہی میں غور کرلو کہ اللہ تعالیٰ نے کیا کیا نعمتیں عطا فرما رکھی ہیں۔

رات کو سونے سے پہلے یہ عمل کرلو

ان نعمتوں کا مراقبہ کیا کرو، اس مراقبہ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس ذات نے یہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں، اس کی محبت دل میں پیدا ہوگی۔ اس مراقبہ کا بہترین طریقہ جو حضرت والا نے بیان فرمایا: یہ ہے کہ رات کو سونے سے پہلے پانچ دس منٹ اس مراقبہ کے لئے مختص کرلو، اور اس مراقبہ میں ان نعمتوں کا دھیان کرو جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہوئی ہیں، ایک ایک نعمت کا دھیان کر کے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے جاؤ، اے اللہ! آپ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے آنکھ عطا فرمائی ہے، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ ، اے اللہ! آپ نے میری آنکھ میں صحت اور بینائی عطا فرمائی ہے، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ ، اے اللہ! آپ نے مجھے کان عطا فرمائے ہیں، اور اس میں شنوائی کی طاقت عطا فرمائی، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ ، اے اللہ! آپ نے زبان عطا فرمائی، اور اس میں گویائی کی طاقت عطا فرمائی، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ ، اے اللہ! آپ نے مجھے یہ دانت عطا فرمائے، جو صحیح سالم ہیں، اور یہ کھانے کا کام دے رہے ہیں، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ ، اے اللہ! آپ نے مجھے یہ ہاتھ عطا فرمائے ہیں، جن کے ذریعے میں اپنے کام انجام دیتا ہوں، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ ، اے اللہ! آپ نے مجھے پاؤں عطا فرمائے، اس میں چلنے کی طاقت عطا فرمائی، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ

وَلَکَ الشُّکْرُ ، اس طرح ایک ایک عضو کا تصور کر کے اور ان کے اندر جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے رکھی ہیں، ان کا تصور کرو، اور پھر ان پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

گردو پیش کی نعمتوں پر شکر

پھر اپنے اِردگرد کے ماحول پر نظر ڈالو اور یہ کہو کہ: اے اللہ! آپ نے مجھے گھر عطا فرمایا، جو عافیت کا گھر ہے، اور نہ جانے کتنے لوگ ہیں جو گھر کے بغیر زندگی گزار رہے ہیں، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ ، اے اللہ! آپ نے آرام دہ بستر عطا فرمایا، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ ، اے اللہ! آپ نے مجھے بیوی بچے عطا فرمائے جو محبت کرنے والے ہیں، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ ، ایک ایک چیز کی طرف دھیان لے جاؤ، اور پھر ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

پریشانی کے وقت نعمتوں کا استحضار

انسان پر کوئی نہ کوئی تکلیف اور پریشانی بعض اوقات آجاتی ہے، لیکن انسان کا کام یہ نہیں ان پریشانیوں کو لے کر بیٹھ جائے، اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بھول جائے، بلکہ عین پریشانی اور عین تکلیف کے وقت بھی اگر غور کرو گے تو اس وقت میں بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اس مصیبت اور تکلیف کے مقابلے میں ہزاروں لاکھوں گنا زیادہ نظر آئیں گی، مگر چونکہ انسان بے صبرا ہے، جب کوئی تکلیف آتی ہے تو اسی کو لے کر بیٹھ جاتا ہے، اور نعمتوں کو بھول جاتا ہے۔

میاں صاحب پیدائشی ولی تھے

میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک استاذ تھے، حضرت میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جو ''میاں صاحب'' کے نام سے مشہور تھے، بڑے عجیب بزرگ تھے، اور پیدائشی ولی تھے، میرے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، میرے دادا فرمایا کرتے تھے کہ یہ پیدائشی ولی ہیں، اس لئے کہ یہ بچپن سے میرے پاس پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے، اس وقت سے لے کر آج تک کبھی انہوں نے جھوٹ نہیں بولا، جب میں بچوں کو پڑھا رہا ہوتا، کوئی بچہ کوئی شرارت کر لیتا، تو میں ڈانٹ کر پوچھتا کہ یہ کس نے کیا ہے؟ سب بچے خاموش دم بخود ہو جاتے، لیکن یہ کھڑے ہو جاتے اور کہتے کہ استاد جی! مجھ سے یہ غلطی ہو گئی، اس وقت بھی کبھی ان کی زبان پر جھوٹ نہیں آیا۔

بیماری میں شکر کا انداز

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سنایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ مجھے اطلاع ملی کہ وہ بیمار ہیں، میں ان کی عیادت کے لئے گیا، جا کر دیکھا تو شدید بخار کے اندر تپ رہے ہیں، شدید بے چینی کے اندر ہیں، میں نے پوچھا کہ حضرت کیسی طبیعت ہے؟ فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ ہماری آنکھیں صحیح کام کر رہی ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے کان بہت اچھی طرح کام کر رہے ہیں، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اللہ کا شکر ہے کہ گویائی کی قوت بحال ہے، الحمدللہ جگر، دل اور معدہ ٹھیک ہے، بس بخار ہو رہا ہے، دعا کر دیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھی دور فرما دیں۔ دیکھئے! جو

تکلیفیں نہیں تھیں، ان کا ذکر کر کے پہلے ان پر شکر ادا فرمایا، پھر آخر میں بخار کا ذکر کیا۔ یہ وہ لوگ تھے کہ عین تکلیف کے وقت بھی اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں مبذول ہیں، ان کی طرف دھیان جا رہا ہے، اور ان پر شکر ادا ہو رہا ہے، اس کے بعد تکلیف کا بھی تھوڑا سا تذکرہ کر دیا، اور اس کو بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کر دیا، یہ ہے ایک شکر گزار بندے کا طرزِ عمل۔

نعمتوں پر شکر ادا کرو

ہم جیسوں کا تو یہ حال ہے کہ جب ذرا سی تکلیف آ جائے تو اس وقت ہم ساری نعمتیں بھلا بیٹھتے ہیں، اور اس تکلیف کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں، اسی پر شکوہ شکایت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ

یعنی میرے بندوں میں شکر گزار بندے بہت کم ہیں، جو نعمتیں میں نے ان پر ہر وقت مبذول کر رکھی ہیں، ان کا احساس ہی نہیں ہے، ان نعمتوں کا دھیان ہی نہیں۔ اس لئے فرمایا کہ نعمتوں کو یاد کرو، اور ان پر شکر ادا کرو، جو تکلیفیں تم پر آ رہی ہیں، بے شک ان کو بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرو، اور کہو کہ: اے اللہ! میں کمزور ہوں، مجھ سے یہ تکلیف برداشت نہیں ہو رہی ہے، آپ اپنے فضل و کرم سے میری اس تکلیف کو دور کر دیجئے، آپ نے جہاں اتنی نعمتیں عطا فرمائی ہیں، اس تکلیف کے دور ہونے کی نعمت بھی عطا فرما دیں، لیکن خدا کے لئے ان موجودہ نعمتوں کی ناشکری نہ کریں۔

''دانت'' ایک عظیم نعمت ہے

ہماری ایک بہن کی جب عمر زیادہ ہوگئی، اور ان کے دانت ٹوٹنے لگے، ایک مرتبہ وہ اپنا دانت نکلوا کر واپس آئیں تو وہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہنے لگیں کہ ابا جی! یہ دانت بھی عجیب چیز ہیں کہ یہ آتے وقت بھی تکلیف دیتے ہیں اور جاتے وقت بھی تکلیف دیتے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ جب بچپن میں دانت نکلتے ہیں تو اس کے نتیجے میں بچے کو دست آرہے ہیں، کبھی بخار آرہا ہے، اور بڑی عمر میں جب یہ ٹوٹتے ہیں تو اس وقت بھی یہ بہت تکلیف دیتے ہیں، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی بات سن کر ایک آہ بھری، اور فرمایا: خدا کی بندی! تمہیں ان دانتوں کی دو ہی چیزیں یاد رہیں کہ انہوں نے آتے وقت بھی تکلیف دی، اور جاتے وقت بھی تکلیف دے رہے ہیں، اور پچاس ساٹھ سال کی درمیانی مدت میں ان سے جو مزہ لیا ہے، ان سے جو راحت حاصل کی ہے، جو ذائقہ حاصل کیا ہے، اس کا کبھی دھیان اور خیال نہیں آیا؟ ٹھیک ہے کہ آتے وقت بھی تکلیف ہوئی، اور جاتے وقت بھی تھوڑی سی تکلیف ہو رہی ہے، لیکن سالہا سال تک اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس چکی سے منوں اور ٹنوں خوراک کو پیسا ہے، اور اس کو اپنے جسم کا جز بنایا ہے، اس کی طرف دھیان نہیں۔ بس ذرا سی تکلیف آجاتی ہے تو ہم اس کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بھول جاتے ہیں۔

اللہ والوں کی صحبت کا فائدہ

اللہ والوں کی صحبت سے یہی بات حاصل ہوتی ہے کہ وہ انسان کا زاویہ نگاہ

درست کر دیتے ہیں، اب تک نگاہ تکلیفوں پر، مصیبتوں پر اور پریشانیوں پر جارہی تھی، اللہ والے کی صحبت کے نتیجے میں نعمت پر جانے لگتی ہے۔ ٹھیک ہے جو تکلیفیں ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کر دیں، اور کہہ دیں کہ: یا اللہ! میں کمزور ہوں، میں اس تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتا، اے اللہ! اپنی رحمت سے اس کو دور فرما دیجئے، لیکن جو تمہیں نعمتیں دی ہیں، کم از کم ان کو تو مت بھولو۔

کیا محسن سے محبت نہیں ہوگی؟

لہٰذا رات کو سونے سے پہلے تھوڑی دیر بیٹھ کر نعمتوں کا جائزہ لو، اپنے جسم پر ہونے والی نعمتوں کا، اپنے گرد و پیش پر ہونے والی نعمتوں کا، اپنے گھر والوں پر ہونے والی نعمتوں کا جائزہ لو، اور ان میں سے ایک ایک پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اسی کا نام "مراقبہ" ہے، یہ مراقبہ بڑا اکسیر ہے، روزانہ کر کے دیکھو، اس لئے کہ جب روزانہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مراقبہ کرو گے تو اس کے نتیجے میں خود بخود اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوگی۔ فرض کرو کہ کوئی شخص تمہارے دروازے پر روزانہ پیسے پھینک کر چلا جاتا ہے، تم اس کو اٹھا کر اپنی ضروریات پوری کر لیتے ہو، اور اس طرح تمہارا کام چل رہا ہے، اب خود بخود تمہارے دل میں اس شخص کو دیکھنے کا شوق پیدا ہو جائے گا کہ یہ شخص جو روزانہ پیسے ڈال کر جا رہا ہے، اور میری حاجتیں پوری کر رہا ہے، اس کو دیکھوں تو سہی، پھر اس کو دیکھنے کا موقع ملے یا نہ ملے، لیکن اس کی محبت دل میں ضرور پیدا ہوگی۔ وہ ایک انسان جو دن میں صرف ایک مرتبہ تمہارے دروازے پر پیسے ڈال گیا، اور اس کے ذریعے تمہاری حاجتیں پوری ہو گئیں، جب

اس کا تصور کر کے تمہارے دل میں اس کی محبت پیدا ہو رہی ہے، تو وہ ذات جو ہر وقت تمہارے اوپر نعمتوں کا گھن نچھاور کر رہی ہے، وہ ذات اگرچہ نظر نہیں آرہی ہے، لیکن کیا تم اس سے محبت نہیں کرو گے؟ کیا اس کی نعمتوں کے تصور سے اس کے ساتھ محبت پیدا نہیں ہوگی؟ اس لئے روزانہ رات کو دس منٹ کے لئے نعمتوں کے استحضار کا مراقبہ کیا کرو، اور ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کرو۔

شکر ادا کرنے کا عجیب وغریب واقعہ

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے یہ چیز اپنے ایک عزیز سے سیکھی، وہ روزانہ رات کو سونے سے پہلے بستر پر بیٹھے ان الفاظ کی رٹ لگاتے، اور بار بار فرماتے، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ آپ رات کو سونے سے پہلے یہ کیا کرتے ہیں؟ جواب میں فرمایا: ہاں بھائی، سارے دن تو نعمتوں پر شکر ادا کرنے کا موقع نہیں ملتا، اس لئے میں رات کو سونے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار کرتا ہوں، اور ایک ایک نعمت کا دھیان کر کے اس پر اللہ تعالیٰ شکر ادا کرتا ہوں۔ حضرت ڈاکٹر صاحبؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے شکر ادا کرنے کا عجیب طریقہ بیان فرمادیا۔ بہر حال، رات کو سونے سے پہلے صرف دس منٹ اس کام کے لئے نکال لو، اور اس وقت چھوٹی چھوٹی نعمتوں کا بھی تصور کرو، اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، یہ عمل تمہارے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرے گا، اور جب اللہ تعالیٰ کی ذات سے

محبت اور تعلق پیدا ہو جائے گا تو پھر سب کچھ آسان ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین،

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

اللہ کی محبت

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک

اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶

مجلس نمبر : ۸۷

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

اللہ کی محبت

پیدا کرنے کے اسباب اور طریقے

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین، والعاقبة للمتقین،
والصّلوٰة والسّلام علی رسوله الکریم وعلی آله
و اصحابه اجمعین، امّا بعد!

دوسرا طریقہ: انعامات کو سوچنا

یہ مضمون کئی روز سے چل رہا ہے، اس کا موضوع ہے "تعلق مع اللہ کی اہمیت اور اس کو پیدا کرنے کا طریقہ" اللہ جل شانہ کی محبت سارے دین کی بنیاد ہے، حضرت والا نے اللہ کی محبت پیدا کرنے کے طریقوں میں پہلا طریقہ بیان فرمایا "کثرت ذکر اللہ" اس کی تھوڑی سی تفصیل پچھلے بیانات میں عرض کر دی۔ دوسری چیز جس کا گذشتہ کل تھوڑا سا ذکر ہوا تھا، وہ یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے انعامات اور اپنے برتاؤ کو سوچنا" اللہ جل شانہ کی وہ نعمتیں جو ہر وقت ہر انسان پر مبذول ہیں، ان کا تصور اور دھیان کرنے کے نتیجے میں اپنے محسن حقیقی کی محبت

دل میں پیدا ہوگی، ظاہر ہے کہ جو شخص ہر وقت دوسرے کا زیر بار احسان ہو، اور دوسرا شخص اس پر بے مانگے بھی احسان کر رہا ہے تو طبعی بات یہ ہے کہ اس شخص سے محبت پیدا ہوگی۔

ان کے انعامات سب پر عام ہیں

اللہ تعالیٰ جن کے انعامات کا سلسلہ غیر متناہی ہے، جب ان انعامات کا بار بار تصور کیا جائے گا، تو ان کی محبت دل میں پیدا ہوگی، بات صرف دھیان کی ہے، ان کے انعامات تو مسلسل جاری ہیں، تم شکر کرو، یا ناشکری کرو، ان کے انعامات میں تو کمی نہیں ہے، ان کی نعمتوں میں کمی نہیں آرہی ہے، شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ادیم زمین سفرهٔ عام اوست

بری خوانِ نعمت چه دشمن چه دوست

یعنی اللہ تعالیٰ نے اس پوری زمین کو ایسا عام دستر خوان بنا رکھا ہے کہ ساری مخلوق اس کی نعمتوں سے مستفید ہو رہی ہے، اور اس دستر خوان پر دشمن اور دوست کی کوئی تفریق نہیں، دشمن کو بھی اسی طرح دے رہے ہیں، جس طرح دوست کو دے رہے ہیں، اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی ظاہری نعمتیں مسلمان اور کافر سب پر جاری ہیں، بلکہ بعض اوقات کافروں پر زیادہ ہو رہی ہیں، وہ مسلمانوں سے زیادہ خوشحال ہیں، زیادہ ترقی کر رہے ہیں، ان کے پاس زیادہ پیسہ ہے، ان کے پاس دولت زیادہ ہے، اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں کہ فلاں دشمن مجھے جھٹلا رہا

ہے، میری توہین کر رہا ہے، میری گستاخی کر رہا ہے، میرے وجود کا بھی منکر ہے، پھر بھی اللہ تعالیٰ اس کو نعمتیں دے رہے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔

دوستوں کو تنگی اور دشمنوں کو فراخی

بلکہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں اپنے پیارے محبوب بندوں کو اس دنیا میں تنگی کا شکار کیا جاتا ہے، اور دشمنوں کو نوازا جاتا ہے، چنانچہ مولانا رومی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

ماپروریم دشمن وما می کشیم دوست

کس را چرا و چوں نہ رسد در قضاء ما

یعنی بعض اوقات ہم دشمن کو پالیتے ہیں، اور اپنے دوست کو مارتے ہیں، قتل کرادیتے ہیں، جیسے سامری جادوگر کو جبرئیل امین علیہ السلام کے ذریعہ پالا جارہا ہے، اور دوسری طرف حضرت الیاس علیہ السلام کو آروں سے چروادیا گیا۔ لہٰذا دنیا کے اندر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں دوست، دشمن، مسلم اور کافر سب پر جاری ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے اندر تو کوئی کمی واقع نہیں ہو رہی ہے۔

ان نعمتوں کی طرف دھیان نہیں

کوئی جو ناشناسِ ادا ہو تو کیا علاج

ان کی نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں

وہ تو ہر وقت جاری ہیں، بات صرف دھیان کی ہے کہ ہم اس کی ان نعمتوں کی طرف سے غافل ہیں، اس کا دھیان نہیں کرتے، اس کا استحضار نہیں

کرتے، اس کی وجہ سے ان نعمتوں کا خیال نہیں کرتے، اگر اللہ تعالیٰ ان کا دھیان کرنے کی توفیق عطا فرمادے، اور ان کو یاد کرنے کی توفیق عطا فرمادے، تو پھر یہ ممکن نہیں ہے کہ آدمی ان نعمتوں کو سوچے، اور پھر بھی اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا نہ ہو۔ اس لئے کل میں نے عرض کیا تھا کہ رات کو سونے سے پہلے نعمتوں کا استحضار کر کے اس پر شکرادا کیا کرو۔ بہر حال! محبت پیدا کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو سوچنا۔

تیسرا طریقہ: اپنے برتاؤ کو سوچنا

اس کے بعد حضرت فرماتے ہیں کہ ساتھ میں اپنے برتاؤ کو بھی سوچے، یعنی یہ سوچے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا یہ عالم ہے کہ بارش کی طرح ہر لمحے برس رہی ہیں، اور دوسری طرف میرا برتاؤ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ذرا سی عبادت کا حکم دیا ہے، اسی میں سستی کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ نے جس گناہ سے بچنے کا حکم دیا تھا، اس سے بچنے میں سستی کر رہا ہوں، اسی کو مولانا رومی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ:

کارسازِ ما بسازِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

یعنی ہمارا کارساز تو دن رات ہمارے کام میں لگا ہوا ہے، ہماری حاجتوں کو پورا کر رہا ہے، ہم پر اپنی نعمتوں کا نازل فرمارہا ہے، لیکن جو کام ہمارے سپرد کیا گیا تھا، وہ کام ہمارے لئے آزار بنا ہوا ہے، ہم اس کو اپنے لئے

مصیبت سمجھ رہے ہیں کہ یہ نماز پڑھنا، یہ روزے رکھنا اور گناہوں سے بچنا، ان کو مصیبت سمجھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے جواب میں بندے کا طرز عمل کتنی ناشکری والا طرز عمل ہے، اگر انسان یہ سوچے کہ میرے اس طرز عمل کے باوجود اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے اوپر نعمتوں کی بارش ہو رہی ہے، تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا ہوگی۔ اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کو اور پھر اپنے برتاؤ کو سوچو۔

اپنی حیثیت میں غور کرو

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت کا ایک اور مطلب بھی ہو سکتا ہے جو حضرت والا نے دوسری جگہ بیان فرمایا ہے، جیسا کہ ہمارے بھائی کلیم صاحب نے بتایا کہ انہوں نے حضرت کے وعظ میں یہ پڑھا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اور اپنے برتاؤ کو سوچنے سے اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اپنی حیثیت میں غور کرنے سے بھی دل میں محبت پیدا ہوتی ہے۔ اپنی حیثیت میں غور کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی عظمت، اس کا جلال، اس کی کبریائی، اس کی رحمتیں، اس کی قدرت کاملہ، اس کی حکمت بالغہ میں غور کرے، اور دوسری طرف اپنی کم حیثیتی کا تصور کرے کہ میری تو کوئی حقیقت نہیں، میں تو کسی کام پر قادر نہیں، میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب ان کی عطا ہے، ورنہ میرے پاس تو کچھ نہیں تھا، نہ میں اپنے وجود کو خود سے وجود میں لا سکتا تھا، نہ میں اپنے آپ زندہ رکھ سکتا تھا، نہ یہ شکل و صورت، نہ یہ صحت، نہ یہ

علم حاصل کرسکتا تھا، ان میں سے کچھ بھی میرے پاس نہیں تھا، یہ سب کچھ انہی کی عطا ہے، اور وہ جب چاہیں چھین لیں، واپس لے لیں۔

اس سے اللہ کا شکر اور محبت بڑھتی ہے

اور جب سب کچھ انہی کی عطا ہے تو پھر میں کس بات پر تکبر کروں، کس بات پر اتراؤں، کس بات پر عجب اور خود پسندی کے اندر مبتلا ہوں، اس لئے کہ اپنی ذات میں تو میرے پاس کچھ بھی نہیں، یہ ہے "اپنی حیثیت کو سوچنا" اس سے بھی اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے، اس لئے کہ جتنا اپنی کم حیثیتی کا احساس ہوگا، اتنا ہی اللہ جل جلالہ کی نعمتوں کی عظمت کا احساس ہوگا۔ اگر انسان اپنے آپ کو ان نعمتوں کا مستحق سمجھے تو وہ سوچے گا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ کام میرے ساتھ کرنا ہی چاہئے تھا، اللہ تعالیٰ کو یہ نعمتیں مجھے دینی تھیں، ایسا انسان اللہ تعالیٰ کا کیا شکر ادا کرے گا، اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کہاں سے پیدا ہوگی؟ لیکن اگر انسان یہ سوچتا ہے کہ میں بے حیثیت ہوں، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کی نعمتیں میرے اوپر نازل ہورہی ہیں، تو پھر اللہ تعالیٰ کے شکر کا اور اس کی محبت کا احساس دل میں پیدا ہوگا۔

ایک بزرگ اور متکبر کا واقعہ

جب دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم بڑے آدمی ہیں، ہمیں شان و شوکت حاصل ہے، تکبر کے احساسات دل میں پیدا ہورہے ہیں، اس وقت انسان دوسرے سے کہتا ہے کہ: جانتے نہیں ہم کون ہیں؟ چنانچہ ایک شخص سے

ایک بزرگ نے کوئی اصلاح کی بات کہی تو اس نے پلٹ کر کہا کہ: جانتے نہیں ہم کون ہیں؟ یعنی ہم تو اتنے بڑے آدمی ہیں، تم ہماری اصلاح کرتے ہو؟ جواب میں ان بزرگ نے فرمایا کہ ہاں! میں جانتا ہوں تم کون ہو، تمہاری حقیقت یہ ہے کہ:

انسان کی حقیقت

اَوَّلُكَ نُطفَةٌ مَذِرَةٌ وَآخِرُكَ جِيفَةٌ قَذِرَةٌ،

وَأَنتَ فِيمَا بَيْنَ ذٰلِكَ تَحْمِلُ الْعَذِرَةَ

یعنی تمہاری ابتداء ایک گندہ اور ناپاک نطفہ اور منی کا قطرہ تھا، اصل تو تمہاری یہ ہے، اور آخری انجام تمہارا یہ ہے کہ تم بدبودار مردار بننے والے ہو، ایسے بدبودار کہ تمہارے گھر والے بھی چوبیس گھنٹے تمہیں اپنے گھر میں رکھنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے، وہ تمہارے مرنے پر روئیں گے، لیکن رکھنے کو تیار نہیں ہوں گے، وہ یہ کہیں گے کہ اس میں سے جو بدبو اٹھے گی اس کو برداشت کرنا ہمارے بس میں نہیں، لہٰذا فوراً قبرستان لے جاکر قبر میں ڈال دیں گے، اور پیدائش سے لے کر وفات تک جو درمیان کا زمانہ ہے، اس زمانے میں تو ہر وقت نجاست کا بوجھ اٹھائے پھر رہا ہے، یہ کوئی مبالغہ نہیں، بلکہ حقیقت ہے، کیونکہ اگر غور کرو گے تو یہ نظر آئے گا کہ انسان سر سے لے کر پاؤں تک نجاستوں کا پلندا ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس کھال کے ذریعہ ہماری پردہ پوشی کر رکھی ہے، عیب چھپے ہوئے ہیں، گندگی چھپی ہوئی ہے، ورنہ اس خوبصورت چہرے

پر ذرا سا چیرا لگاؤ، تو اندر سے گندگی نکل آئے گی، کہیں خون بھرا ہوا ہے، کہیں پیپ بھری ہوئی ہے، کہیں پیشاب اور کہیں پاخانہ بھرا ہوا ہے۔ اس وقت تو سب لوگ محبت کر رہے ہیں، اپنے پاس بٹھا رہے ہیں، لیکن اگر چہرے سے کھال اتر جائے تو کوئی پاس بیٹھنے کو بھی تیار نہ ہو، بلکہ نفرت کریں، اور دیکھنے کو بھی تیار نہ ہو، وہی خوبصورت چہرہ خوفناک بن جائے گا، اور دیکھ کر ڈر لگے گا۔ لہٰذا تیری ابتداء گندے نطفے سے ہوئی، اور تیری انتہاء ایک بدبودار مردار پر ہوگی، اور درمیان کے زمانے میں تو گندگی اٹھائے پھر رہا ہے، یہ تیری حقیقت ہے، اور پھر بھی یہ کہتا ہے کہ "جانتا نہیں میں کون ہوں؟

شکستگی مطلوب ہے

جب تک انسان کو اپنی اس حقیقت کا ادراک اور احساس نہ ہو، اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی نہ تو نعمتوں کا ادراک ہو سکتا ہے، اور نہ ہی اللہ جل شانہ کی محبت کما حقہ پیدا ہو سکتی ہے، اسی لئے حضرت فرماتے ہیں کہ "اپنی حیثیت کو پہچانو" اور اس طریق میں اول و آخر سبق یہی ہے کہ "اپنی حقیقت کو پہچاننا اور اپنے آپ کو مٹانا اور فنا کرنا" جس میں دعویٰ ہو، جس میں تعلّی ہو، جو شان و شوکت بنائے، اور جو تکبر کرے، اس کو اس طریق کی ہوا بھی نہیں لگی، یہاں شکستگی مطلوب ہے، اپنی حیثیت کا احساس ہو، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے شکستگی ہو۔

اپنی نظر میں چھوٹا دوسروں کی نظر میں بڑا

اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی: اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ

فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْرًا وَفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْرًا ، اے اللہ! مجھے اپنی آنکھ میں چھوٹا بنا دیجئے، یعنی جب میں اپنے آپ کو دیکھوں تو اپنے آپ کو چھوٹا سمجھوں، تاکہ میرے اندر تواضع پیدا ہو، البتہ لوگوں کی نگاہ میں بڑا بنا دیجئے، اس لئے کہ اگر لوگ بھی مجھے چھوٹا سمجھنے لگیں گے تو وہ مجھ پر ظلم اور زیادتی کریں گے، کسی نے خوب کہا ہے کہ:

سگ باش ، و برادر خورد مباش

کتے بن جاؤ، لیکن چھوٹے بھائی مت بنو۔ مطلب یہ ہے کہ ساری بلائیں چھوٹے بھائی پر نازل ہوتی ہیں، اس لئے کہ اگر دوسرے یہ سمجھنے لگیں کہ یہ چھوٹا ہے تو لوگ اس پر ظلم کریں گے، اس کو بھون کر ہی کھا جائیں گے، چونکہ یہ چھوٹا ہے اس لئے جو سلوک چاہو، اس کے ساتھ کرو۔ لہٰذا اپنے دفاع کے لئے اور اپنے بچاؤ کے لئے لوگوں کی نگاہ میں اے اللہ! مجھے بڑا بنا دیجئے، لیکن میں اپنے آپ کو چھوٹا ہی سمجھتا رہوں۔

اول و آخر "فنا ہی فنا"

حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے میں تو پہلا و آخری سبق "فنا ہی فنا" ہے، یعنی اپنے آپ کو مٹانا، فرماتے ہیں کہ جو شخص مشیخت، پیری اور شان و شوکت کا راستہ اپنائے، اس کو ہمارے راستے کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اسلئے عام آدمی کی طرح رہو، کوئی شان و شوکت بنانے کی ضرورت نہیں، شان بنانے سے پرہیز کرو، اور اپنی

حیثیت کو پیش نظر رکھو، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ادراک ہوگا، اور پھر شکر کی توفیق ہوگی، اور اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوگی۔

چوتھا طریقہ: اللہ والوں کی صحبت

آگے حضرت والا نے محبت پیدا کرنے والے اسباب میں سے چوتھا سبب یہ بیان فرمایا کہ "کسی اہل اللہ سے تعلق رکھنا" یہ بھی محبت پیدا کرنے کا بڑا قوی ذریعہ ہے، بلکہ شاید سب سے قوی ذریعہ ہو، اس لئے کہ اللہ والوں سے جتنی محبت ہوگی، اور اللہ والوں سے تعلق ہوگا، ان کی صحبت اٹھاؤ گے، ان کے ساتھ رہو گے، اتنی ہی اللہ جل جلالہ کی محبت دل میں بڑھے گی۔ ہمارے حضرت ایک شعر پڑھا کرتے تھے:

ان سے ملنے کی ہے یہی اک راہ
ملنے والوں سے راہ پیدا کر

ان سے ملنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان سے جو ملنے والے ہیں، ان سے راہ پیدا کر، ان سے تعلق جوڑ لے، تو پھر انشاء اللہ وہ بھی مل جائیں گے۔ لہٰذا جو اللہ والے ہیں، جن کے دلوں میں اللہ کی محبت سمائی ہوئی ہے، ان کی صحبت اختیار کرنا، ان کے قریب رہنا، ان سے تعلق پیدا کرنا، ان سے محبت کرنا، ان کاموں سے اللہ تعالیٰ کی محبت تمہارے دل میں بھی پیدا ہوگی۔

اللہ کی محبت بھر رہا ہوں

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ مجلس میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پر بیان فرمارہے تھے، حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ بھی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، دوران بیان حضرت مجذوب صاحب نے فرمایا کہ حضرت! خدا کے واسطے کچھ ہمارے دل میں بھی بھر دیجئے، حضرت نے فرمایا میں اور کیا کر رہا ہوں، یعنی یہ جو بیان ہو رہا ہے، اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی محبت تمہارے دلوں میں بھری جارہی ہے، اور کیا کر رہا ہوں۔ بہرحال! جب آدمی اللہ والوں کے پاس بیٹھتا ہے، ان کی باتیں سنتا ہے، ان کے ملفوظات کو سنتا ہے، ان کی اداؤں کو دیکھتا ہے، تو ان سب کاموں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے رابطہ جڑتا ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ کی محبت میں قوت پیدا ہوتی ہے، اسی لئے حضرت والا نے اسباب محبت میں یہ بیان فرمایا کہ: کسی اللہ والے سے تعلق رکھنا۔

پانچواں طریقہ: طاعت پر مواظبت

اسباب محبت میں پانچواں سبب یہ بیان فرمایا کہ "طاعت پر مواظبت کرنا" یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرنا، جتنی زیادہ اطاعت کرو گے اتنی ہی محبت بڑھے گی۔ اللہ تعالیٰ نے "محبت" اور "اطاعت" کے درمیان عجیب رشتہ رکھا ہے، وہ یہ کہ "اطاعت" سے محبت پیدا ہوتی ہے، اور پھر "محبت" سے مزید اطاعت ہوتی ہے، پھر اس "اطاعت" سے مزید "محبت" پیدا ہوتی ہے، پھر اس "محبت" سے مزید "اطاعت" انجام پاتی ہے، یہ سلسلہ ایک لامتناہی حد تک چلا جاتا ہے۔

یہ تو "دور" لازم آرہا ہے؟

اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ یہ کہا جاتا ہے اللہ کے حکم کی اطاعت کرنے اور دین کے حکم پر چلنے کا آسان راستہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا کرلی جائے، جب یہ پوچھا گیا کہ "محبت" کیسے پیدا کریں؟ تو یہ کہا گیا کہ محبت پیدا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، یہ تو "دور" لازم آگیا، یعنی یہ کہا جارہا ہے کہ دین پر چلنا ہے تو محبت کرو، اور محبت پیدا کرنے کے لئے دین پر چلو، یہ تو "دور" لازم آرہا ہے کہ جن دو چیزوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان میں سے ہر ایک دوسرے پر موقوف ہورہی ہے۔ اس کے جواب کو غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

شروع میں تھوڑی سے محنت اور ہمت

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ جو بندہ بھی ابتداء میں تھوڑی سے محنت کرکے اطاعت کرے گا تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس کو "محبت" کا ایک خاص درجہ عطا فرمائیں گے، پھر "محبت" کے اس درجہ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مزید "اطاعت" کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا۔ جس کا حاصل یہ ہوا کہ شروع میں بغیر کسی محنت اور عمل کے خود بخود محبت پیدا نہیں ہوگی، اور نہ ہی خود بخود اطاعت کرنا آسان ہوگا، بلکہ دین شروع میں تھوڑی سے قربانی مانگے گا، تھوڑی سے محنت اور ہمت مانگے گا، اس ہمت اور محنت کے بغیر یہ دولت نہیں ملتی، لہٰذا شروع میں آدمی کو یہ کرنا پڑے گا کہ اپنی خواہشات کے خلاف، اور

اپنے دنیاوی اور بشری تقاضوں کے خلاف تھوڑی سے محنت کرنی پڑے گی، اور جب ایک مرتبہ انسان وہ محنت کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ایک نورِ محبت پیدا فرمادیتے ہیں۔

ریل بھاپ کے ذریعہ تیز چلتی ہے

اس بات کو حضرت والا نے دوسری جگہ پر ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا ہے، فرمایا کہ جیسے ریل کے انجن میں اگر بھاپ بھری ہوئی ہو (اُس زمانے میں ریل بھاپ کے ذریعہ چلائی جاتی تھی، پٹرول اور ڈیزل دستیاب نہیں تھا) تو وہ ریل بہت تیز بھاگتی ہے، لیکن اگر ریل میں سب چیزیں موجود ہیں، پہیے بھی لگے ہیں، لیکن انجن کے اندر بھاپ نہیں ہے، اب اگر کوئی شخص دھکا لگا کر اس ریل کو چلانا چاہے گا تو وہ ریل پورے دن میں بمشکل ایک دو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرے گی، لیکن اگر انجن میں بھاپ بھری ہوئی ہے، اور اس بھاپ کے ذریعہ اس ریل کو چلایا جائے گا تو وہ دن بھر میں چار پانچ سو میل کا فاصلہ طے کرے گی۔

"محبت" بمنزلہ "بھاپ" کے ہے

حضرت فرماتے ہیں کہ ٹرین کے تیز رفتار چلنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے، ایک بھاپ کی، دوسارے پہیوں کی، اگر انجن اور بھاپ نہ ہو، صرف پہیے ہوں تو وہ ٹرین تیز نہیں چل سکتی، اور اگر بھاپ ہو، لیکن پہیے نہ ہوں، تو وہ بھاپ اس ٹرین کو تباہ کردے گا، اور وہ ٹرین زمین کے اندر دھنس جائے گی۔ لہٰذا بھاپ کی بھی ضرورت ہے، اور پہیوں کی بھی ضرورت ہے۔ حضرت

فرماتے ہیں کہ اسی طرح انسان کے اندر "محبت" بمنزلہ "بھاپ" کے ہے، اور "عمل" بمنزلہ "پہیے" کے ہیں، اس لئے پہلے تھوڑا سا "عمل" تو کرنا پڑے گا، پھر اس "عمل" کے نتیجے میں جب "محبت" کی بھاپ پیدا ہوگی، تو پھر تیز رفتاری سے ترقی ہوگی، اور تیز رفتاری سے "عمل" ہوگا۔

اڑنے سے پہلے زمین پر جہاز کا چلنا

آج کل کی مثال سے یوں سمجھ لیں، جیسے یہ ہوائی جہاز ہے، یہ ہوا میں اُڑتا ہے، اور ہوا میں پانچ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتا ہے، لیکن اُڑنے سے پہلے ہوائی جہاز کو زمین پر "ٹیکسی" کرنے پڑتی ہے، کوئی جہاز ایسا نہیں ہے جو کھڑا کھڑا سیدھا اُڑ جائے، بلکہ تھوڑی دیر اس کو زمین پر چلنا پڑتا ہے، یہ وقت مجھ جیسے مسافر کے لئے بڑا صبر آزما وقت ہوتا ہے، اس لئے کہ جب جہاز اُڑ جاتا ہے تو میں اپنے لکھنے کے کام میں مشغول ہو جاتا ہوں، اور جب تک زمین پر چل رہا ہوتا ہے اس وقت تک کوئی کام نہیں کرسکتا، بہرحال! ہر جہاز اُڑنے سے پہلے زمین پر آہستہ آہستہ چلتا ہے، پھر اُڑتا ہے۔ بالکل اسی طرح "محبت" پیدا کرنے کے لئے تھوڑی محنت کرنے پڑے گی، اور تھوڑا سا "عمل" کرنا پڑے گا، اور جب اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت میں اپنی خواہشات کے خلاف عمل کرنا شروع کرو گے تو پھر "محبت" کی بھاپ تمہارے اندر پیدا ہو جائے گی، اور پھر تیز رفتاری سے ترقی ہوگی۔

ایمان کی لذت حاصل کرلو

یہی معنی اس حدیث کے ہیں جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی نامحرم پر لذت لینے کے لئے نگاہ ڈالنے کو دل چاہ رہا ہے، اور بہت شدید تقاضا ہو رہا ہے کہ میں اس پر نگاہ ڈال کر لذت حاصل کرلوں، لیکن اگر تم نے اللہ کے حکم کا خیال کر کیااللہ کے ڈر سے اس نگاہ کو بچالیا، اور نظر نہیں ڈالی، اور نظر ہٹانے کے تکلیف اپنے نفس پر برداشت کرلی تو اللہ تعالیٰ تمہیں ایمان کی ایسی لذت عطا فرمائیں گے کہ گناہوں کی لذت اس کے سامنے ہیچ در ہیچ ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ بندے سے فرماتے ہیں کے اے بندے! میں نے تیرے اوپر صبح سے لے کر شام تک کتنے انعامات کر رکھے ہیں، تیرے اوپر نعمتوں کی بارش ہو رہی ہے، تجھ سے صرف یہ مطالبہ ہے کہ میری خاطر ناجائز خواہشات سے اپنے آپ کو تھوڑی دیر کے لئے بچالے، اور جب تو اپنے آپ کو اس سے بچائے گا تو میں تجھ سے یہ وعدہ کر رہا ہوں کہ:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (سورۃ الروم:۶۹)

یعنی جو لوگ ہمارے راستے میں تھوڑی سی کوشش کریں گے تو ہم ضرور بالضرور ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے راستوں پر لے جائیں گے۔

خواہشات کو روکنے کے لئے یہ تصور مفید ہے

لہٰذا تھوڑی سی قربانی دینی ہوگی، یہ جنت اتنی سستی نہیں ہے، اور یہ محبت اتنی سستی نہیں ہے، اور وہ قربانی یہ ہے کہ نفس کو ناجائز خواہشات سے روکنے کی

عادت ڈالو، اور اس کام میں آسانی پیدا کرنے کے لئے یہ تصور کرو کہ یہ دنیا ہے، یہ جنت نہیں ہے، اور اس دنیا کے اندر بڑے سے بڑا انسان چاہے وہ بڑے سے بڑا حاکم ہو، بڑے سے بڑا سرمایہ دار ہو، اور دولت مند ہو، کیا وہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ میری مرضی کے موافق ہو رہا ہے، بلکہ اس دنیا میں ہر انسان پر اس کی مرضی کے خلاف حالات پیش آتے ہیں، اور آتے رہیں گے، اس سے بچنا ممکن نہیں۔ آج جن کے ہاتھ میں پوری دنیا کی کمان ہے، جن کے پاس دولت کے انبار لگے ہوئے ہیں، نوکر چاکر ہیں، حشم خدم موجود ہیں، اور دنیا بھر کے تمام وسائل ان کو میسر ہیں ان سے جا کر پوچھو کیا تمہاری طبیعت کے خلاف کوئی واقعہ ہوا یا نہیں؟ بسا اوقات ان کی طبیعت کے خلاف اتنی زیادہ باتیں ہوتی ہیں، جتنی ہماری اور آپ کی طبیعت کے خلاف نہیں ہوتیں۔ لہٰذا یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں ہمیشہ خوش رہوں، اور مجھے کبھی کوئی غم اور تکلیف نہ آئے، کبھی کوئی صدمہ نہ پہنچے، اور کبھی کوئی خلاف طبع بات نہ ہو۔ لہٰذا طبیعت کے خلاف تو حالات پیش آئیں گے۔

دو راستے

اب دو راستے ہیں، ایک راستہ تو یہ ہے کہ طبیعت کے خلاف کرنے کے لئے ایسے کاموں کو اختیار کر لو جس کے نتیجے میں اللہ جل شانہ راضی ہو جائیں۔ اور اللہ تعالیٰ فرمائیں کہ دیکھو! یہ ہے میرا بندہ، جس نے میری خاطر اپنی طبیعت کے تقاضے کو پامال کر دیا۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ اپنی خواہشات کو پورا کرتے رہو،

اس کی کوشش کرتے رہو، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم ساری زندگی خواہشات کو پورا کرنے میں لگے رہو گے، اور اللہ تعالیٰ سے دور ہوتے چلے جاؤ گے۔ لہٰذا جب خواہشات کے خلاف کام ہونے ہی ہیں، چاہے تم کچھ بھی کرلو، تو پھر اللہ کے حکم کی خاطر خواہشات کے خلاف کام کیوں نہ کرلو۔

یہ تکلیف لذیذ بن جائے گی

اور جب تم ایک مرتبہ یہ تصور کرو گے کہ میں طبیعت کے خلاف یہ کام اللہ جل شانہ کی اطاعت میں کر رہا ہوں، تو اس صورت میں وہ تکلیف بھی بالآخر لذیذ بن جائے گی، کیوں؟ اس لئے کہ جب یہ تصور آئے گا کہ میں نے الحمد للہ اپنے محبوب حقیقی کی خاطر اپنے نفس کو پامال کیا ہے تو اس سے طبیعت کو جو انشراح نصیب ہوگا، اور اس سے جو نور پیدا ہوگا، اس سے جو فرحت اور انبساط پیدا ہوگا، اس کے سامنے دنیا کی ہزاروں لذتیں قربان ہیں۔

اللہ تعالیٰ ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ ہے

اللہ تعالیٰ تم سے یہ چاہتے ہیں کہ کبھی کبھی میرا بندہ اپنے دل پر چوٹ مارا کرے، مثلاً ایک کام کرنے کو دل چاہ رہا ہے، لیکن اپنے دل پر چوٹ مار کر رک گیا، اور جب اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے دل پر چوٹ مارلی تو اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اس دل میں آکر بیٹھوں گا، یہ دل میری تجلی گاہ ہوگا، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُنْکَسِرَۃِ قُلُوْبُھُمْ

یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جن کے دل ٹوٹے ہوئے ہیں۔ اب دل کا ٹوٹنا دو طرح سے ہوتا ہے، ۱۔ یا تو غیر اختیاری طور پر دل ٹوٹے ہوئے ہیں، اس لئے کہ ان کے ساتھ مصائب پیش آئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ان کے ساتھ ہوں، ۲۔ دوسرے معنٰی یہ ہیں کہ دل میں گناہ کرنے کی خواہش پیدا ہو رہی تھی، لیکن انہوں نے اپنی خواہشات کو پامال کر کے اپنا دل توڑا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔

یہ دل ان کی تجلی گاہ ہے

اس بات کو کہنے کے لئے اقبال مرحوم نے بڑا خوبصورت شعر کہا ہے کہ:

تو بچا بچا کہ نہ رکھ اسے کہ یہ آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

یعنی ایسا نہ کر کہ تیرا دل بچا رہے، اور اس میں جو خواہش پیدا ہو رہی ہے تو اس کو ہمیشہ پورا کرتا رہے، تو ایسا نہ کر، اس لئے کہ جس ذات نے یہ دل کا آئینہ بنایا ہے، اس ذات کا کہنا یہ ہے کہ جتنا یہ دل کا آئینہ ٹوٹے گا اتنا ہی یہ محبوب ہوگا، اتنا ہی میں اس دل کا ساتھی بنوں گا۔ یہ "دل" اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بنایا ہے، یہ "دل" انہی کی تجلی گاہ ہے، اس میں کسی دوسری چیز کی شمولیت اللہ تعالیٰ کو گوارہ نہیں ہے، اور یہ "دل" اللہ تعالیٰ کے لئے اس وقت بنتا ہے جب خواہشات کے شیشے توڑے جاتے ہیں۔

ہم اس گھر میں رہیں گے جسے برباد کیا

میں نے بھی ایک شعر کہا تھا، ہمارے بزرگ حضرت حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم اس شعر کو بہت پسند کرتے ہیں، اور اپنی مجلسوں میں سنایا کرتے ہیں، وہ یہ کہ:

دردِ دل دے کے مجھے اس نے ارشاد کیا
ہم اسی گھر میں رہیں گے جسے برباد کیا

دل کو برباد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خواہشات کو اللہ کے لئے پامال کریں، دل میں گناہوں کے تقاضے اٹھ رہے ہیں، دل میں گناہوں کے داعیے پیدا ہو رہے ہیں، اور چاروں طرف سے گناہ کے محرکات گناہ کی طرف بلا رہے ہیں، لیکن میں نے اپنے اللہ کی خاطر اس دل کو توڑ کر برباد کیا، تو پھر اللہ تعالیٰ اس دل میں مقیم ہوتے ہیں، پھر وہ دل اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ بنتا ہے۔

محبت سے طاعت، طاعت سے محبت کا نتیجہ

اسی بات کو حضرت والا یہاں فرما رہے ہیں کہ جب پہلے اطاعت کرنے کے لئے تھوڑی سی قربانی دو گے، تھوڑا سا آگے بڑھو گے، اور خواہشات کو پامال کرنے کی کوشش کرو گے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنی "محبت" عطا فرمائیں گے، یہ ان کا وعدہ ہے، ممکن نہیں ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا نہ ہو، اور جب "محبت" پیدا ہو جائے گی تو اس "محبت" کے نتیجے میں جو کام پہلے بھاری اور مشکل معلوم ہو رہے تھے، وہ آسان نظر آئیں گے، اور مزید "طاعت"

ہوگی اور جب مزید "طاعت" ہوگی تو "محبت" اور بڑھے گی، اور "محبت" میں اضافہ ہوگا، اور جب "محبت" میں اضافہ ہوگا تو اور "طاعت" آئے گی، اور یہ سلسلہ مرتے دم تک چلتا رہے گا، یہاں تک کہ موت کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ پیغام آجائے گا کہ:

يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِيْ إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ○ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ ○ وَ ادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (سورۃ الفجر: ۲۷،۲۸،۲۹،۳۰)

اے اطمینان والی جان: آج اپنے پروردگار کی طرف آجا، جس کی محبت میں تو نے زندگی کے دن رات گزارے ہیں، آج آکر میرے بندوں میں شامل ہوجا، اور میری جنت میں داخل ہوجا۔ یہ ہے انجام اس سارے تسلسل کا، یعنی طاعت سے محبت، اور محبت سے طاعت، پھر طاعت سے محبت، پھر محبت سے طاعت، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس مقام تک پہنچا دیتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں اس راستے پر لگا دے، آمین۔

اطاعت کا آسان نسخہ، اتباع رسول

اسی طاعت کا سب سے آسان اور مختصر نسخہ وہ ہے جو قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنے کا بتایا ہے، وہ یہ ہے کہ فرمایا:

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

(سورۃ آل عمران: ۱۳)

اللہ تعالیٰ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے فرما رہے ہیں کہ ان سے کہہ

دو، یعنی تمام ایمان والوں سے کہدو کہ اگر تم واقعی اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو۔
اس کا ایک ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا چاہتے ہو، تو اس
کا آسان راستہ یہ ہے کہ تم میری اتباع کرو، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
اتباع کرو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پھر اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں گے۔

حضور کی اتباع کرو، اللہ تعالیٰ محبت کریں گے

بظاہر تو یوں کہنا چاہئے تھا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو اس
کا آسان راستہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرو، جب حضور
اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی محبت تمہارے دل میں پیدا
ہو جائے گی، اور تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے لگو گے۔ لیکن اس طرح نہیں فرمایا۔
بلکہ یہ فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ سے محبت کا ارادہ ہے تو میری اتباع کرو، تو اللہ تعالیٰ تم
سے محبت کرے گا۔ اس طرح کیوں فرمایا؟ دراصل اس سے اشارہ اس طرف
فرمادیا کہ ارے تم کیا اللہ تعالیٰ سے محبت کروگے، تم کہاں، اللہ میاں کہاں،
اس لئے کہ تمہارا وجود ناقص، تمہاری ذات ناقص، تمہاری ذات متناہی، جبکہ اللہ
تعالیٰ کی ذات واجب الوجود، غیر متناہی، تم کیسے اللہ تعالیٰ سے محبت کروگے؟ اور
تمہیں اللہ تعالیٰ کی حقیقی محبت اور اس کے اندر کمال کیسے حاصل ہوسکتا ہے؟ البتہ
جب تم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کروگے تو پھر اللہ تعالیٰ تم سے محبت
کرے گا، اور پھر اس کی محبت کا عکس تمہارے دلوں پر پڑے گا، اس عکس کو اللہ
تعالیٰ کی محبت کہیں گے۔

محبت پہلے محبوب کے دل میں پیدا ہوتی ہے

کسی فارسی شاعر نے اسی بات کو شعر میں کہا ہے کہ:

عشقِ اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود

یعنی پہلے محبوب اور معشوق کے دل میں محبت پیدا ہوتی ہے، اور پھر محبوب کی محبت کا عکس محب کے دل پر پڑتا ہے، اس طرح محبت محب کی طرف منتقل ہوتی ہے۔ یہی معاملہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا ہے، کیونکہ جس ذات کو دیکھا نہ ہو، جس کی معرفت کاملہ حاصل نہ ہو تو اس ذات سے انسان کیسے محبت کرے گا؟ اللہ تعالیٰ کی ذات ہمارے تصور اور خیال سے ماوراء ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ پہلے میں تم سے محبت کروں گا، اور جب میں محبت کروں گا تو میری محبت کا عکس تمہارے دل میں آئے گا، اور پھر تم اللہ سے محبت کرو گے۔

ہر کام میں حضور کی اتباع

بہر حال! قرآن کریم نے یہ حقیقت بتادی کہ اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کا بہترین اور آسان ترین راستہ ''اتباع سنت'' ہے، ہر کام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع ہے، اپنی چال ڈھال میں، اپنی وضع قطع میں، اپنی بول چال میں، اپنی صورت و سیرت میں، اپنی کردار میں، اٹھنے بیٹھنے میں، کھانے پینے میں، معاملات میں، معاشرت میں، ایک دوسرے کے ساتھ میل جول میں، اخلاق میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ''سنت'' اختیار کرلو، جوں جوں ''سنت'' کی اتباع کرتے جاؤ گے، اتنی ہی اللہ تعالیٰ کی محبت بڑھتی جائے گی۔

کوئی ''سنت'' چھوٹی نہیں

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی بندہ جس کسی وقت بھی کسی سنت پر عمل کررہا ہوتا ہے، چاہے وہ سنت دیکھنے میں چھوٹی نظر آرہی ہو، ویسے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت چھوٹی نہیں، ہر سنت عظیم الشان ہے۔ اس وقت وہ بندہ اللہ تعالیٰ کا محبوب ہوتا ہے، مثلاً مسجد میں داخل ہوتے ہوئے تم نے دایاں پاؤں پہلے اندر رکھا یہ سوچتے ہوئے کہ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، اور مسجد میں داخل ہوتے وقت وہ دعا پڑھی جو مسنون ہے: ''اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ'' اگرچہ یہ چھوٹا سا عمل ہے، لیکن جب اتباع سنت کی خاطر تم یہ عمل کررہے ہو تو جس وقت یہ عمل کررہے ہو اس وقت تم اللہ تعالیٰ کے محبوب بن رہے ہو۔

اس وقت تم اللہ کے محبوب بن رہے ہو

یا مثلاً تم بیت الخلاء میں داخل ہو رہے ہو، داخل ہوتے وقت بایاں پاؤں اس نیت سے داخل کیا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، اور داخل ہونے سے پہلے مسنون دعا پڑھ لی تو اس وقت تم اللہ تعالیٰ کے محبوب بن رہے ہو، بیت الخلاء سے باہر نکلتے وقت دایاں پاؤں اس نیت سے باہر نکالا کہ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، اور باہر نکل کر مسنون دعا پڑھ لی تو تم اس وقت اللہ تعالیٰ کے محبوب بن رہے ہو، اس لئے کہ تم اللہ کے محبوب کی سنت پر عمل کر رہے ہو۔ لہٰذا جتنا جتنا تم اتباع سنت میں بڑھتے چلے جاؤ گے، اللہ تعالیٰ کی محبت

بڑھتی چلی جائے گی، اور اس کے نتیجے میں دین پر عمل کرنا مزید آسان ہوتا چلا جائے گا۔

وہ سنتیں جس میں کوئی مشقت نہیں

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں تو بے شمار ہیں، اور ہر شعبہ زندگی میں ہیں، لیکن بہت سی سنتیں ایسی ہیں کہ ان کو اختیار کرنے میں کچھ خرچ نہیں ہوتا، نہ وقت لگتا ہے، نہ پیسے لگتے ہیں، نہ محنت صرف ہوتی ہے، صرف دھیان کی بات ہے، جیسے ابھی بتایا کہ سنت یہ ہے کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت دایاں پاؤں داخل کرو، اور نکلتے وقت بایاں پاؤں نکالو، بتاؤ! اس پر عمل میں کیا تکلیف ہے؟ کتنا وقت صرف ہوتا ہے؟ کتنے پیسے خرچ ہوتے ہیں؟ کتنی محنت لگتی ہے؟ ارے بھائی! پاؤں تو نکالنا ہی ہے، صرف دھیان کرنے کی بات ہے، دھیان نہ کرنے کے نتیجے میں سنت کی برکت اور رحمت سے محروم ہو جاتے ہیں، کوئی اگر یہ سوال کرے کہ کیا دایاں پاؤں مسجد سے نکالنا گناہ ہے؟ یہی جواب دیا جائے کہ گناہ نہیں، کیا فرض و واجب ہے کہ بایاں پاؤں ہی پہلے نکالو؟ نہیں، فرض و واجب بھی نہیں، لیکن اس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں ایک بڑی رحمت سے محرومی ہے، اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے نتیجے میں جو رحمتیں نازل ہوتی ہیں، اور جو اللہ تعالیٰ کی محبوبیت حاصل ہوتی ہے، اس نعمت سے محرومی ہے۔ اسی طرح کھانا کھاتے وقت کی سنت یہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے کھانا کھاؤ، اور بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کرو، اور جب کھانا کھا چکو تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو،

اور دعا پڑھو، کیا ایسا کرنا فرض و واجب ہے؟ نہیں، ایسا نہ کرنا گناہ ہے؟ نہیں، گناہ بھی نہیں، اللہ تعالیٰ کے یہاں نہ کرنے پر کوئی پکڑ بھی نہیں، لیکن نہ کرنے کے نتیجے میں انسان اپنے آپ کو ایک عظیم نعمت سے محروم کر رہا ہے، جو نعمت مفت میں حاصل ہو رہی تھی۔

سنتوں کی ڈائری

لہٰذا ہر انسان اپنی زندگی کا ذرا جائزہ لے، اور یہ دیکھے کہ میں کہاں کہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو چھوڑے ہوئے ہوں، ہمارے حضرت والا کی کتاب ہے "اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم" حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میں نے تمہارے لئے ڈائری بنادی ہے، اس کتاب کو سامنے رکھ کر اپنا جائزہ لیتے رہو کہ کہاں کہاں میں سنت پر عمل کر رہا ہوں، اور کہاں کہاں چھوڑے ہوئے ہوں، بس، جہاں عمل چھوڑے ہوئے ہو، وہاں عمل کرنا شروع کر دو، بے شمار سنتیں ایسی ہیں جو صرف تمہارے دھیان کی منتظر ہیں، اس میں نہ محنت، نہ مشقت، نہ پیسہ، نہ وقت کچھ بھی خرچ نہیں ہوتا، البتہ کچھ سنتیں ایسی ہیں جو کچھ وقت اور محنت کا تقاضا کرتی ہیں، تھوڑی سے محنت کرلو گے تو ان پر بھی عمل ہو جائے گا۔

جب تک بازار میں لوکی ملے ضرور لاؤ

ہمارے حضرت والا یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ میں نے اپنے گھر میں دیکھا کہ دستر خوان پر لوکی کی ترکاری یا سالم

ضرور ہوتا تھا، کئی دن تک دیکھتا رہا کہ روزانہ لوکی کی ترکاری ضرور ہوتی ہے، میں ایک دن اہلیہ سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے آپ کئی روز سے لوکی کی ترکاری مسلسل پکا رہی ہیں، انہوں نے جواب دیا کہ میں ایک کتاب میں پڑھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو لوکی بہت پسند تھی، اس لئے میں نے سودا لانے والے سے کہہ دیا ہے کہ جب تک بازار میں لوکی ملے تو ضرور لوکی لایا کرو، تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل کی کچھ اتباع نصیب ہو جائے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے اپنی اہلیہ کی یہ بات سنی تو مجھے لرزہ سا آ گیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی سنت جو نہ فرض ہے، نہ واجب ہے، بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محض ایک عادت ہے، اس عورت کو تو اس سنت کا اتنا اہتمام ہے، اور ہم اپنے آپ کو عالم کہلاتے ہیں، لوگ ہمیں عالم کہتے ہیں، سمجھتے ہیں، لیکن ہمیں حضور کی سنت کا اتنا اہتمام نہیں۔

تین دن تک زندگی کا جائزہ

اس کے بعد میں نے یہ تہیہ کر لیا کہ جب تک میں اپنی ساری زندگی کا جائزہ لے کر نہیں دیکھوں گا کہ میں کہاں کہاں حضور کی سنت پر عمل نہیں کر رہا ہوں، اس وقت تک آگے نہیں بڑھوں گا، چنانچہ زندگی کا جائزہ لینے میں تین دن لگائے، اور یہ دیکھا کہ کہاں کہاں میں اتباع سنت سے محروم ہوں، اور پھر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے راہِ عمل واضح ہو گیا، اور جو سنتیں چھوٹی ہوئی تھیں، اللہ تعالیٰ نے ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرما دی۔ بہرحال! یہ اتباع سنت ایسی چیز

ہے کہ جتنا بھی آپ اس کی طرف بڑھیں گے، اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں سمائے گی۔

یہ طعنے گلے کا ہار ہیں

بسا اوقات جب آدمی اتباع سنت کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو اس کو طعنے بھی دیے جاتے ہیں، اس پر فقرے بھی کسے جاتے ہیں، بعض اوقات اس کا مذاق بھی اُڑایا جاتا ہے، ان فقروں اور طعنوں کی وجہ سے بعض لوگ کمزور پڑ جاتے ہیں، حالانکہ قرآن کریم نے ایسے لوگوں کی تعریف کی ہے کہ:

يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ

(سورۃ المآئدۃ: ۵۴)

یعنی یہ لوگ اللہ کے راستے میں محنت کرتے ہیں، اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے، دنیا والے لوگ جو چاہیں کہا کریں، چاہے وہ ہمیں "دقیانوس" کہیں، یا ہمیں "رجعت پسند" کہیں، یا "جاہلانہ اسلام والے" کہیں، ارے یہ طعنے تو اللہ کے راستے پر چلنے والے کا ہار ہے، یہ طعنے تو انبیاء علیہم السلام کو دیے گئے، ان کو "بے وقوف" کہا گیا، اور ان انبیاء کے متبعین سے کہا گیا کہ:

اَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ (سورۃ البقرۃ: ۱۳)

کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح یہ بے وقوف ایمان لائے، یہ سارے طعنے انبیاء علیہم السلام کو بھی ملے ہیں، اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کو بھی ملے ہیں، ان کو "پاگل" کہا گیا، ان کو "گمراہ" کہا گیا، لیکن

درحقیقت جب اللہ تعالیٰ کے راستے میں یہ طعنے پڑتے ہیں تو ایک مؤمن کے لئے تمغہ ہے، کہاں تک دنیا والوں کی زبانیں روکو گے؟ کب تک ان کی پرواہ کرو گے۔

قیامت کے روز ایمان والے ان پر ہنسیں گے

لہٰذا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے راستے میں چلو تو طعنوں سے بے نیاز ہو جاؤ، کمر کس کر تیار ہو جاؤ، اور یہ سوچو کہ جو طعنہ ہمیں اس راستے میں ملے گا وہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے باعث اعزاز ہے، لیکن قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ:

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ

(سورۃ التطفیف:۳۴)

کہ آج وہ وقت آگیا کہ آج ایمان والے ان منکرین پر ہنسیں گے، وہ وقت آکر رہے گا، اس کے آنے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ لہٰذا دنیا والوں کے طعنوں سے بے نیاز ہو جاؤ، اگر تم اللہ کے راستے پر چلنا چاہتے ہو۔

جس کو ہو جان و دل عزیز
اس کی گلی میں جائے کیوں

جب اس راستے پر چلے ہو تو ان طعنوں کو برداشت کرنا پڑے گا، اللہ تعالیٰ اپنے فضل کرم سے اور اپنی رحمت سے ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العٰلمین

اللہ سے اللہ کی محبت مانگیے

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک

اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶

مجلس نمبر : ۸۸

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

اللہ سے اللہ کی محبت مانگیے

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین و العاقبة للمتقین و الصلوٰة و السلام
علی رسوله الکریم و علی آلہٖ و اصحابہٖ أجمعین، امّابعد!

محبت حاصل کرنے کا پانچواں سبب

گذشتہ چند دنوں سے اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے اسباب کا بیان چل رہا ہے، اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کے پانچ اسباب بیان فرمائے ہیں، ان میں سے چار اسباب کا بیان الحمد للہ تفصیل سے ہو چکا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

آگے پانچواں سبب یہ بیان فرمایا کہ حق تعالیٰ سے دعا کرنا۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک مطلب تو وہ ہے جو کل عرض کیا تھا کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے کچھ نہ کچھ مانگتے رہو، دل ہی دل میں چلتے پھرتے مانگتے رہو، اٹھتے بیٹھتے مانگتے رہو۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ "محبت بھی انہی سے مانگو" اور کہو کہ یا

اللہ! ہم آپ کی محبت کے محتاج ہیں، آپ ہی اپنی محبت ہمیں دیدیجئے۔ چنانچہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی کہ:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ حُبَّكَ وَ حُبَّ مَنْ يَنْفَعُنِیْ حُبُّهٗ عِنْدَكَ

اے اللہ! میں آپ سے آپ کی محبت مانگتا ہوں کہ میرے دل میں آپ کی محبت پیدا ہو، اور جس کی محبت آپ کے نزدیک مجھے فائدہ پہنچانے والی ہو، اس کی محبت عطا فرما۔ ایک اور دعا میں آپ نے فرما:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ الْاَشْيَاءِ اِلَیَّ

اے اللہ! اپنی محبت کو دنیا کی ساری چیزوں سے زیادہ محبوب بنادیجئے۔

اللہ کی محبت ان تین چیزوں سے زیادہ

ایک اور دعا میں آپ نے فرمایا:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ نَفْسِیْ وَ اَهْلِیْ وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ

اے اللہ! اپنی محبت کو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز بنادیجئے، اپنے گھر والوں سے زیادہ عزیز بنادیجئے، اور ٹھنڈے پانی سے زیادہ محبوب بنا دیجئے۔ اس سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ٹھنڈے پانی سے محبت اور شوق کا اندازہ ہوتا ہے۔

ٹھنڈا پانی بہت مرغوب تھا

چنانچہ آپ کو ٹھنڈا پانی اتنا مرغوب تھا کہ ''بئر غرس'' جو مدینہ منورہ سے دو میل کے فاصلے پر کنواں تھا، وہاں سے آپ کے لئے پانی لایا جاتا تھا، چنانچہ کسی

اور چیز کے بارے میں احادیث میں یہ منقول نہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو فلاں غذا زیادہ مرغوب تھی، اور وہ غذا فلاں جگہ سے لائی جاتی تھی، صرف پانی کے بارے میں یہ منقول ہے کہ ''بئر غرس'' سے آپ کے لئے لایا جاتا تھا، اس لئے کہ اس کا پانی دوسرے کنوؤں کے مقابلے میں زیادہ ٹھنڈا اور شاید زیادہ میٹھا ہوتا تھا، اور آپ نے یہ وصیت فرمائی تھی کہ وفات کے بعد مجھے غسل بھی اس ''بئر غرس'' کے پانی سے دیا جائے، چنانچہ ''بئر غرس'' کے پانی سے آپ کو غسل کو دیا گیا۔ آپ کو ٹھنڈا پانی اتنا زیادہ پسند تھا اس لئے آپ دعا فرمارہے ہیں کہ اے اللہ! اپنی ذات کو میری جان سے زیادہ محبوب بنا دیجئے، میرے گھر والوں سے زیادہ محبوب بنا دیجئے، اور ٹھنڈے پانی سے زیادہ محبوب بنا دیجئے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ یا اللہ! اپنی محبت عطا فرما، اور اپنی محبت کو تمام محبتوں پر غالب فرما۔

جھولی اور پیالہ بھی انہی سے مانگو

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک دن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مجلس میں یہ مضمون بیان فرمارہے تھے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ سے مانگنی چاہئے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں دینے میں کوئی کمی نہیں۔ وہی بات جو کسی نے کہی ہے کہ:

کوئی جو ناشناسِ ادا ہو تو کیا علاج
ان کی نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں

حضرت نے فرمایا کہ مانگنے میں نقص رہ جاتا ہے، ورنہ اگر انسان مانگے تو

اللہ تعالیٰ کے یہاں دینے میں کوئی کمی نہیں۔ بس میاں! اللہ تعالیٰ کے سامنے جھولی پھیلانے والا چاہئے، پھر اللہ تعالیٰ اس جھولی کو بھر کر ہی بھیجتے ہیں، حضرت مجذوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سوال کیا کہ حضرت! اگر کسی کے پاس جھولی ہی نہ ہو تو پھر کیا کرے؟ حضرت نے فرمایا کہ جھولی بھی انہی سے مانگے، اور یہ کہے کہ یا اللہ! میرے پاس تو جھولی بھی نہیں ہے، اپنی رحمت سے مجھے جھولی بھی عطا فرما دیجئے، میرے اندر مانگنے کا سلیقہ بھی نہیں ہے، مانگنے کا سلیقہ بھی عطا فرما دیجئے۔

مانگنے کا طریقہ بھی انہی سے مانگو

چنانچہ ایک دعا میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح مانگا:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُكَ خَیۡرَ الۡمَسۡئَلَةِ وَخَیۡرَ الدُّعَاءِ وَخَیۡرَ الۡاِجَابَةِ

اے اللہ! میں آپ سے بہترین سوال کرنے کا سوال کرتا ہوں، یعنی میں آپ سے اچھے سوال کروں، اور اچھی باتیں مانگوں، اے اللہ! میں آپ سے یہ مانگتا ہوں کہ مجھے اچھی دعا کرنے کی توفیق ہو، اور اچھی طرح قبول بھی ہو۔ لہٰذا جھولی بھی انہی سے مانگو۔

اچھی دعا مانگنے کی توفیق انہی سے مانگو

جب آپ کسی قبولیتِ دعا کے مواقع میں جائیں، یا قبولیتِ دعا کا موقع آپ کو مل جائے، جس میں دعا کی قبولیت کی امید زیادہ ہوتی ہے، مثلاً افطار کا وقت ہے، یا سحری کا وقت، یا تہجد کا وقت، یا جمعہ کا دن ہے، یا بیت اللہ شریف پر

پہلی نظر پڑنے کا موقع ہے، یا آپ طواف کر رہے ہیں وغیرہ، ایسے مواقع پر دعا کرنے سے پہلے یہ مانگو کہ یا اللہ! مجھے اچھی دعا کرنے کی توفیق دیدے، یعنی ایسی دعا کروں جو میرے دین و دنیا کے لئے فائدہ مند ہو، اور پھر اے اللہ! اس کو میرے حق میں قبول بھی فرمالیجئے۔ لہٰذا ان تمام مواقع قبولیت میں دعا کرنے کی توفیق بھی اللہ ہی سے مانگو۔

بیت اللہ پر پہلی نظر کے وقت دعا

جب آدمی پہلی مرتبہ بیت اللہ شریف کو دیکھتا ہے تو آدمی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ موقع آرہا ہے، اس موقع پر کیا مانگوں؟ اللہ کے بندوں کے عجیب عجیب مدارک ہوتے ہیں، چنانچہ ایک مرتبہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ اس موقع پر کیا مانگوں؟ امام صاحب نے فرمایا کہ میاں دعا مانگ لینا کہ میں ''مستجاب الدعوات'' بن جاؤں کہ ساری عمر میری ساری دعائیں قبول ہوا کریں۔ اللہ تعالیٰ نے امام صاحب کے دل میں یہ بات ڈال دی۔ بہر حال! مانگنا بھی ایک ہنر اور ایک فن ہے، جو ہر ایک کو نہیں آتا۔ میرا جب حرمین جانا ہوا، اور بیت اللہ پر نظر پڑی تو میں نے کہا: یا اللہ! میری سمجھ میں تو نہیں آرہا ہے، یا اللہ! جو دعا آپ کے نزدیک میرے حق میں بہتر ہو، وہ دعا میرے دل میں ڈال دیجئے، اور اس طرح دعا کے کرنے کی توفیق دیدیجئے۔ وہی بات جو حضرت والا نے بیان فرمائی کہ جھولی بھی انہی سے مانگو۔ اسی طرح محبت بھی انہی سے مانگو کہ یا اللہ! اپنی محبت میرے دل میں پیدا فرمادیجئے، اور اس محبت کو ساری

محبتوں پر غالب فرما دیجئے۔

اسباب محبت کا خلاصہ

بہر حال! حضرت والا نے اسباب محبت میں چھ باتیں ذکر فرمائیں، (۱) کثرتِ ذکر اللہ (۲) اللہ تعالیٰ کے انعامات کو یاد کرنا (۳) اپنے برتاؤ کو اور حقیقت کو سوچنا (۴) کسی اہل اللہ سے تعلق رکھنا (۵) طاعت پر مواظبت کرنا (۶) اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا۔ ان چھ باتوں سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں راسخ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان سب باتوں ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

محبت کا کوئی خاص درجہ طلب مت کرو

آگے حضرت والا کی مجددانہ باتیں سنئے، فرمایا کہ:

> اس تدبیر میں تو کوئی غلطی نہیں، صرف ایک غلطی علمی محتمل ہے، وہ قابل تنبیہ ہے، وہ یہ کہ اپنے ذہن سے محبت کا کوئی درجہ تراش کر اس کا منتظر رہے، یہ غلطی ہوگی۔
>
> (انفاس عیسیٰ : ۱۹۴)

یعنی یہ باتیں اور محبت پیدا کرنے کے جو اسباب بتائے ہیں، ان کے اندر تو کوئی غلطی نہیں ہے، یہ انشاء اللہ بالکل صحیح ہیں، مستند اور معتبر ہیں، اور انشاء اللہ انہی کے ذریعہ محبت پیدا ہوگی۔ لیکن غلطی اس طرح لگتی ہے کہ ''محبت'' کا کوئی

خاص درجہ اپنی طرف سے تراش کر اس کے انتظار میں آدمی بیٹھ جاتا ہے کہ مجھے محبت کا یہ درجہ حاصل ہونا چاہئے، مثلاً دماغ میں یہ تصور لئے بیٹھا ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کو جو محبت حاصل تھی، وہ مجھے حاصل ہو جائے، یا حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کو جو محبت حاصل تھی، وہ مجھے حاصل ہو جائے، اور حضرت شاہ عبد القادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو جو محبت حاصل تھی، وہ مجھے بھی حاصل ہو جائے، گویا کہ ''محبت'' کا ایک درجہ اپنے ذہن سے تراش کر اپنے لئے اس کو تجویز کر لیا کہ مجھے ''محبت'' کا یہ درجہ ملنا چاہئے، اب اس درجے کے انتظار میں بیٹھا ہے، اور پھر جب وہ درجہ محبت کا حاصل نہیں ہوتا تو پھر وہ شخص یا تو اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرتا ہے، یا محبت پیدا کرنے کی تدبیروں کے صحیح ہونے پر شک کرتا ہے، یا پھر مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔

محبت اس کے ظرف کے مطابق دی جاتی ہے

اس لئے یہ فیصلہ کہ کس درجہ کی ''محبت'' تمہیں حاصل ہو؟ تمہیں یہ فیصلہ کرنے کا حق نہیں، یہ فیصلہ وہی ذات کرے گی جو ''محبت'' دینے والی ہے کہ تمہیں کس درجہ کی محبت دینی ہے، اور جس درجہ کی محبت تمہیں دینی ہے، وہی ''محبت'' تمہارے حق میں مفید بھی ہے۔

وہ دیتے ہیں بادۂ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

''ظرف'' کے حساب سے چیز دی جاتی ہے، تمہارا ''ظرف'' جتنا ہے، اتنی ''محبت'' تمہیں ملے گی، باقی تم اپنی طرف سے محبت کا ایک درجہ تراش کر یہ کہو

کہ یہ درجہ محبت کا مجھے ملنا چاہئے، اس کے مطالبے کا تمہیں کوئی حق نہیں، لیکن محبت کا جو درجہ تمہیں ملے گا، انشاء اللہ تمہارے حق میں وہ کافی ہوگا، بشرطیکہ ان تدبیروں پر عمل کرلیا۔

ناشکری اور مایوسی کا شکار ہو جاؤ گے

ہوتا یہ ہے کہ ہم لوگ ایک طرف تو بزرگوں کی بتائی ہوئی تدبیروں پر عمل کرنا شروع کر دیتے ہیں، اور دوسری طرف اپنے لئے کوئی اعلیٰ درجہ تجویز کر لیتے ہیں کہ یہ میری منزل ہے، اور مجھے اس منزل پر پہنچنا ہے، ان تدبیروں پر عمل شروع کرنے کے بعد جب وہ مطلوب منزل بہت دور نظر آتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اب تک جو کچھ حاصل ہوا ہے اس کی ناقدری اور ناشکری شروع کر دیتے ہیں، اور چونکہ وہ مطلوب منزل حاصل نہیں ہو رہی ہے، اس لئے مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں، اور پھر اس مایوسی کے نتیجے میں ان تدابیر کو چھوڑ دیتے ہیں، اور عمل کرنا ترک کر دیتے ہیں۔ اس لئے حضرت والا فرما رہے ہیں کہ اپنی طرف سے کوئی درجہ تجویز مت کرو، اگر تدبیریں صحیح ہیں تو انشاء اللہ ان سے نتیجہ ضرور حاصل ہوگا چاہے اس درجہ کا نتیجہ نہ ہو جو تم نے اپنے لئے تجویز کر رکھا ہے، البتہ تمہارے حق میں جتنا مفید ہے اتنا ضرور حاصل ہوگا، کسی نے خوب کہا ہے کہ:

بر صراط مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

جب اس راستے پر آگئے تو انشاء اللہ ضرور کامیابی ہوگی، بس اِدھر اُدھر دیکھنے کی ضرورت نہیں، جو کچھ تمہیں ملا ہے، اس پر شکر ادا کرو، اور تدبیروں میں

لگے رہو، تمہارے لئے اتنا کافی ہے۔

میرے پیمانے میں لیکن حاصل میخانہ ہے

ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر بڑا عجیب وغریب ہے، کوئی دوسرا شخص اس شعر کو اس وقت تک سمجھ ہی نہیں سکتا جب تک یہ مضمون اس کے سامنے نہ ہو جو میں بیان کر رہا ہوں، فرماتے ہیں کہ:

مجھ کو اس سے کیا غرض کس جام میں ہے کتنی مئے
میرے پیمانے میں لیکن حاصل میخانہ ہے

یعنی مجھ کو اس سے کیا غرض کہ دوسرے لوگوں کو کیا ملا، اور کیا نہیں ملا، لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے جو کچھ عطا فرمایا ہے، میرے لئے تو مناسب وہی ہے، اور حاصل بھی وہی ہے۔ لہٰذا اپنے لئے کوئی درجہ تجویز کرنا، اور پھر نہ ملنے پر شکایت پیدا ہونا، مایوس ہونا، یہ سب غلط ہے، جب تدبیریں سب صحیح ہیں تو ان شاء اللہ اس کا نتیجہ بھی یقیناً ظاہر ہو رہا ہے۔

ایک خط اور حضرت والا کا جواب

ایک مرتبہ میں نے حضرت والا کو خط میں لکھا کہ فلاں کام مجھ سے نہیں ہوتا، فلاں کام مجھ سے نہیں ہوتا، فلاں کام مجھ سے نہیں ہوتا، اور جس آدمی سے یہی کام نہیں ہوتے، وہ دنیا میں اور کیا کام کرے گا؟ حضرت والا نے اس آخری عبارت پر لکیر کھینچ کر اس کے سامنے یہ جواب لکھا کہ:

کیا اپنی ذات سے جلیل القدر امور متوقع ہیں؟

یعنی تمہارا یہ فقرہ کہ جس سے یہ کام نہیں ہو سکتے، اس سے کیا کام ہوگا، گویا کہ اپنی ذات سے بہت جلیل القدر امور کی توقع لگائے بیٹھے ہیں کہ ہم تو اس مقام کے آدمی ہیں، لہٰذا اس بلند مقام کے امور ہم سے سرزد ہونے چاہئیں، وہ امور چونکہ نہیں ہو رہے ہیں لہٰذا مایوسی ہو رہی ہے۔

دراصل اس جواب کے ذریعہ یہ تنبیہ فرمادی کہ درحقیقت دل میں اس خیال کے پیدا ہونے کا منشاء کبر ہے، یعنی اپنے لئے بہت جلیل القدر امور تجویز کر رکھے ہیں کہ یہ ہونے چاہئیں، اور جب وہ نہیں ہو رہے ہیں تو اب مایوس ہو رہے ہیں۔ لہٰذا اس کا منشاء حقیقت میں کبر ہے۔

خلاصہ

بہرحال! خلاصہ یہ ہے کہ ''محبت'' کے حصول کی جو تدبیریں بتائی گئی ہیں، ان پر عمل کرو، اور اپنے لئے ''محبت'' کا کوئی درجہ تجویز مت کرو کہ ''محبت'' کے فلاں درجے تک ہمیں پہنچنا ہے، ان تدبیروں کے نتیجے میں ''محبت'' کا جو درجہ تمہیں ملے گا، وہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا، تم اسی کے مستحق ہوگے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان تدبیروں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمادے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العٰلمین

عبادات میں ذوق وشوق مطلوب نہیں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط وترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک

اصلاحی مجالس : جلد نمبر ٦

مجلس نمبر : ۸۹

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

عبادات میں ذوق وشوق مطلوب نہیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِه الْکَرِیْمِ وَ عَلٰی آلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ،اَمَّا بَعْدُ !

محبت میں بے چین رہوں

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا کہ:

”مجھے اس کا بڑا شوق ہے کہ کسی طرح ہو، اللہ تعالیٰ کی محبت میں ”بے چین“ رہوں“

اس خط کے جواب میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جملہ تحریر فرمایا کہ:

”مگر اس کے ساتھ یہ بھی دعا کرو کہ اس ”بے چینی“ میں چین رہے“

(انفاس عیسیٰ : ۱۹۴)

جواب کچھ اور ہونا چاہیے تھا

یہ جواب جو حضرت والا نے تحریر فرمایا اگر غور کریں تو بڑا عجیب وغریب

جواب ہے، اگر کسی نے یہ جواب نہ پڑھا ہو، اور صرف سوال اس کے سامنے آئے تو جن حضرات نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ اور ملفوظات پڑھے ہوئے ہیں، اور جو لوگ حضرت کے مزاج سے کچھ واقف ہیں، ان کا گمان یہ ہوگا کہ حضرت والا جواب میں یہ فرمائیں گے کہ: یہ کیا تمہیں ''بے چینی'' کا شوق پیدا ہوگیا؟ اس لئے کہ ''بے چینی'' تو ایک غیر اختیاری کیفیت ہے، وہ حاصل ہو کہ نہ ہو، اس کے پیچھے کیوں پڑتے ہو؟ کیونکہ حضرت والا کی تعلیمات کا ایک بہت بڑا اصول یہ ہے کہ آدمی ''اختیاری'' امور کا اہتمام کرے، اور ''غیر اختیاری'' کی فکر میں نہ پڑے، یہ بڑا زرین اصول ہے، اس لئے کہ یہ غیر اختیاری کیفیات کہ کسی وقت عبادت کا ذوق وشوق ہو رہا ہے، کسی وقت ذوق وشوق نہیں ہو رہا، کسی وقت عبادت میں دل لگ رہا ہے، کسی وقت دل نہیں لگ رہا، یہ سب کیفیات آنی جانی ہیں، ان کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں، اصل مقصود ''عمل'' ہے، یہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ اس لئے جو لوگ ''کیفیات'' کے بہت پیچھے پڑتے ہیں، حضرت والا عام طور پر ان کی ہمت افزائی نہیں کیا کرتے۔

ہر مریض کے لئے علیحدہ نسخہ

بہر حال، اگر حضرت والا کا یہ جواب نہ پڑھا ہوتا تو ذہن اس طرف جاتا کہ حضرت والا جواب میں یہ تحریر فرمائیں گے کہ شرعاً یہ کوئی مطلوب بات نہیں کہ آدمی ''بے چین'' رہے۔ لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں پر ان صاحب کو یہ جواب نہیں دیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ طبیب کا کام ہوتا ہے کہ وہ آنے والے

مریض کی حالت کے مناسب نسخہ تجویز کرے، یہ نہیں کہ بس ایک ہی نسخہ سب مریضوں کو گھوٹ کر پلا رہا ہے، اس لئے کہ مریض کے حالات کے مناسب ہر مریض کی دوا اور علاج میں فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک مرشد کامل کا کام بھی یہی ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ اس آدمی کے موجودہ حالات میں یہ بات اس کے مناسب ہوگی یا نہیں؟ یہی ملکہ اللہ تعالیٰ مرشد کامل کو عطا فرماتے ہیں، اور ہم جب اس مرشد کامل کے پاس جاتے ہیں تو وہ ہمارے حالات کے لحاظ سے جواب دیتا ہے۔

''وارد'' اللہ کا مہمان ہوتا ہے

یہاں پر حضرت والا نے اس خط کے جواب میں یہ نہیں لکھا کہ ''تمہیں یہ بے چین ہونے کا شوق کیوں پیدا ہوا؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟'' یہ جواب کیوں نہیں لکھا؟ اس کی وجہ غالباً یہ ہے- واللہ سبحانہ اعلم- کہ حضرت والا نے یہ محسوس فرمایا کہ اس آدمی کے دل میں جو یہ شوق پیدا ہوا ہے، یہ بھی اس شخص کے حق میں ایک ''وارد قلبی'' ہے، اور حضرات صوفیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم یہ فرماتے ہیں کہ من جانب اللہ قلب پر جو ''واردات'' ہوتے ہیں، ان ''واردات'' کی ناقدری نہ کرو، اس لئے کہ یہ ''واردات'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے مہمان ہوتے ہیں، اگر اس مہمان کی خاطر تواضع کرو گے تو یہ مہمان بار بار آئے گا، اور اگر تم نے اس مہمان کی خاطر تواضع نہ کی، بلکہ ناقدری کر دی تو یہ مہمان روٹھ کر بھاگ جائے گا، پھر نہیں آئے گا۔

شریعت میں تو ''چین'' مطلوب ہے

اب اگر اس شخص کو جواب میں یہ لکھ دیتے کہ تیرا اس بے چین رہنے کا خیال درست نہیں ہے، تو اس صورت میں یہ ''وارد'' جو اس کے قلب پر وارد ہو رہا ہے، اس کی مخالفت کرنے سے اس کا نقصان ہوتا، اور آئندہ یہ ''واردات'' بند ہو جاتے، اور اگر جواب میں اس کی ہمت افزائی فرماتے کہ یہ ''بے چینی'' کا حاصل ہونا تو بڑی اچھی بات ہے، ہم بھی دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں یہ ''بے چینی'' عطا فرما دے، تو یہ جواب شریعت کے خلاف ہوتا، اس لئے کہ شریعت میں ''بے چینی'' مطلوب نہیں، شریعت میں تو ''چین'' اور ''اطمینان'' کا حصول مطلوب ہے، قرآن کریم میں ہے کہ:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ

(:)

یعنی اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا شریعت میں یہ مطلوب نہیں کہ کوئی آدمی ''بے چینی'' کو اپنا مقصود بنا لے، بلکہ شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی ''اطمینان'' اور ''چین'' کو مقصود بنائے، اسی لئے خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی:

'' اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسْئَلُكَ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِكَ تَجْمَعُ بِهَا اَمْرِیْ وَتَلُمُّ بِهَا شَعْثِیْ ''

یعنی اے اللہ! میں آپ سے آپ کی رحمت کا سوال کرتا ہوں، جس کے نتیجے میں مجھے جمعیت خاطر اور سکونِ حاصل ہو جائے، اور میری پراگندی کو جمعیت سے

بدل دیجئے۔ معلوم ہوا کہ شریعت میں اطمینان اور چین مقصود ہے، بذات خود ''بے چینی'' مقصود نہیں۔

عجیب وغریب جواب

بہر حال، اگر اس خط کے جواب میں پہلی بات لکھ دیتے تو ''طریقت'' کی خلاف ورزی لازم آتی، اور اگر دوسری بات لکھ دیتے تو ''شریعت'' کی خلاف ورزی لازم آتی، اس لئے حضرت والا نے بڑا عجیب جواب یہ دیا کہ ''مگر اس کے ساتھ یہ بھی دعا کرو کہ اس ''بے چینی'' میں چین رہے''۔ اس لئے کہ ''بے چینی'' بذات خود مطلوب نہیں، بلکہ ''چین'' مطلوب ہے، لیکن وہ ''چین'' اللہ تعالیٰ کی محبت کی ''بے چینی'' کے ذریعہ حاصل ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت میں اضطراب ہو، اور اس اضطراب ہی میں اسے ''چین'' مل جائے۔

ہم اضطراب سے حاصل ''قرار'' کرلیں گے
یہ ''جبر'' ہے تو اسے اختیار کرلیں گے

یہ ''اضطراب'' بذات خود مقصود نہیں، لیکن یہ اضطراب بعض اوقات ''قرار'' پر منتج ہوتا ہے، اور جو آدمی اس راستے سے گزرا نہ ہو، اس کو پوری طرح اس کا ادراک اور احساس اور فہم نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ ابتداء محبت میں تو جوش وخروش، اُبال اور بے چینی ہوتی ہے، پھر ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ اس بے چینی کے اندر ''چین'' آجاتا ہے، اس لئے حضرت والا نے یہ جواب تحریر فرمایا۔

''خلافت'' اس طرح سستی نہیں بٹتی

اس سے پتہ چلا کہ دوسروں کی اصلاح کا کام ہر ایک کے بس کی بات نہیں کہ بس چند اصطلاحات یاد کرلیں، اور لوگوں کی اصلاح کرنی شروع کردی:

هزار نکته‌ء باریك تر زمو ایں جاست
نه هر که سر بتراشد قلندری داند

اس لئے یہ بڑا نازک کام ہے، کسی شخص کے لئے یہ فیصلہ کرنا اس کے لئے کیا بات اس وقت فائدہ مند ہوگی، بڑا مشکل کام ہے۔ اسی واسطے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے میں یہ ''خلافت'' اس طرح سستی نہیں بٹتی تھی، جیسا کہ بعض مشائخ کے یہاں رواج ہے کہ جو آرہا ہے، اس کو ''خلافت'' دے رہے ہیں، جو آرہا ہے، اس کو ''خلافت'' دے رہے ہیں، کسی کو دیکھا کہ وہ نماز وغیرہ پڑھنے لگا ہے، اور اس کے اندر کچھ خشوع وخضوع پیدا ہوگیا ہے، اور کچھ ذکر واذکار کرنے لگا ہے، بس جاتو بھی ''خلیفہ'' ہمارے حضرات کا یہ مزاج نہیں تھا۔

ڈاکٹر بننے کے لئے صحت مند ہونا کافی نہیں

یہ مزاج کیوں نہیں تھا؟ اس لئے کہ خود درست ہوجانا اور بات ہے، اور دوسرے کا علاج کرنا اور بات ہے، ہر صحت مند شخص ''ڈاکٹر'' نہیں ہوتا، صحت مند شخص کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ اس کے اندر کوئی بیماری نہیں ہے، کوئی خرابی نہیں ہے، بہت تندرست ہے، لیکن وہ صحت مند دوسرے بیمار کا علاج کردے، یہ ضروری نہیں۔ اس لئے کہ ''ڈاکٹر'' بننے کے لئے بہت کچھ پڑھنا پڑتا ہے، پاپڑ بیلنے

پڑتے ہیں، اب تک جا کر اس کو ''مطب'' کھولنے کی اجازت ملتی ہے، اب کوئی شخص یہ کہے کہ میں تو بالکل تندرست ہوں، میری ساری رپوٹیں درست ہیں، میرا سارا جسمانی نظام درست ہے، لہٰذا میں ''ڈاکٹر'' بننے کے لائق ہوں، یا کوئی شخص ڈاکٹر کے پاس علاج کے لئے آئے، ڈاکٹر اس کا علاج کرے، اور جب وہ شخص سو فیصد بالکل تندرست ہو جائے تو ڈاکٹر اس کو سرٹیفکیٹ دیدیں کہ تم بھی ڈاکٹر بن جاؤ، اس لئے کہ تم اب تندرست ہو گئے ہو۔

''خلافت'' ایک شہادت اور گواہی ہے

یہی حال یہاں ہے کہ شیخ کے پاس ایک آدمی اپنی اصلاح کے لئے آیا، شیخ نے اس کے حالات کی اصلاح کی، وہ اتباع سنت کی طرف آ گیا، اس کی نماز درست ہو گئی، اس کا روزہ درست ہو گیا، تو محض ان اعمال کے درست ہونے سے وہ ''خلافت'' کا اہل نہیں بن جاتا، اور ''خلافت'' کا مطلب ہے دوسرے کے علاج کرنے کی صلاحیت پیدا ہونا، اور دوسروں کا علاج کرنا، یہ ہر ایک کی بس کی بات نہیں۔

اس لئے ہمارے حضرات کے یہاں ''خلافت'' بہت دیکھ بھال کے بعد جب پورا اطمینان ہو جائے اس وقت دی جاتی ہے، اس لئے کہ ''خلافت'' دینے کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق خدا کے سامنے یہ شہادت اور سرٹیفکیٹ دینا ہے کہ ''ہم نے اس کو اچھی طرح پرکھ لیا ہے، اور جانچ لیا ہے، اور اب یہ شخص تمہارا روحانی علاج یعنی تمہارے امراض باطنی کا علاج کرنے کا اہل ہے'' یہ ''خلافت'' اس بات کا سرٹیفکیٹ دینا نہیں ہے کہ یہ ''تندرست'' ہے، یا متبع سنت ہے، لہٰذا جب تک یہ

اطمینان نہ ہو جائے کہ یہ شخص دوسروں کے علاج کے لائق ہے اور یہ شخص طالبین اور اصلاح کے لئے آنے والوں کو ان کے مزاج اور ان کی ضرورت کے مطابق اس کی حاجت کے مطابق نسخہ تجویز کر سکتا ہے، اس وقت تک یہ ''شہادت'' دینا جائز نہیں۔

ہمارے حضرات یہ خطرہ مول نہیں لیتے

بزرگوں کے رنگ مختلف ہوتے ہیں، بعض بزرگوں کا یہ رنگ اور مزاج ہوتا ہے کہ جب اس شخص کو ہم ''خلافت'' دیدیں گے تو اللہ تعالیٰ اس کو قابل بھی بنادیں گے، لیکن ہمارے حضرات یہ خطرہ مول نہیں لیتے، ہمارے حضرات یہ کہتے ہیں کہ جب تک یہ اطمینان نہیں ہو جائے گا، اس وقت تک یہ خطرہ مول نہیں لیتے، اس لئے کہ اگر کسی نے یہ اصول تو یاد کر لیا کہ ''فلاں چیز محمود ہے، اور فلاں چیز مذموم ہے'' تو بس وہ ہر جگہ یہ اصول چلائے گا، حالانکہ اتنی بات کافی نہیں، بلکہ ایک آنے والے کو دیکھنا پڑتا ہے کہ اس کے لئے کیا مناسب ہے؟ اور کیا مناسب نہیں۔ لہٰذا دوسروں کی اصلاح کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

''خلافت'' کا خیال بدترین حجاب ہے

حضرت والا نے یہ بھی فرمایا کہ جب کسی شیخ کے پاس علاج کے لئے جاؤ تو بس اپنے علاج کی طرف متوجہ رہو، اس فکر میں مت رہو کہ فلاں درجہ مجھے حاصل ہو جائے، فلاں مقام حاصل ہو جائے، بلکہ شیخ کے حکم کی تعمیل میں اور اس کی نگرانی میں نتائج اور ثمرات سے بے فکر ہو کر عمل کرتے رہو۔ بعض لوگ جب کسی شیخ کے پاس اپنی اصلاح کے لئے جاتے ہیں تو ان کے حاشیہ خیال میں یہ بات رہتی ہے کہ یہ شیخ

مجھے کسی وقت ''خلافت'' دیدے گا، یہ ''خیال'' اصلاح کے راستے میں بدترین حجاب ہے، اس خیال کے ہوتے ہوئے کبھی اصلاح مکمل ہو ہی نہیں سکتی، بلکہ ''اصلاح'' کا امکان ہی نہیں۔ اس لئے کہ اس صورت میں اپنی اصلاح کرانے کی نیت میں اخلاص ہی نہیں، بلکہ نیت یہ ہے کہ خاص منصب حاصل ہو جائے، گویا کہ اللہ کے لئے شیخ سے تعلق قائم نہیں کیا، اور اپنی اصلاح میں طلب صادق نہیں تھی، اور جب طلب صادق نہیں ہوتی اور اللہ کے لئے شیخ سے تعلق قائم نہیں کرتا تو شیخ کے پاس جانے کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

لہٰذا جب کبھی شیخ کے پاس جاؤ تو اس خیال سے ذہن کو خالی کر کے جاؤ، صرف اپنی اصلاح کی غرض سے جاؤ، نہ کوئی خاص درجہ حاصل کرنا مقصود ہو، اور نہ کوئی مقام حاصل کرنا مقصود ہو۔

عبادت میں شوق، ولولہ، لذت مطلوب نہیں

آگے حضرت والا ایک اور ملفوظ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

> ''شوق'' بمعنی ''ولولہ'' نہ بالذات مطلوب ہے، نہ شرائط قبول سے ہے، اخلاص کے ساتھ عمل ہونا کافی ہے، گو ''ولولہ'' نہ ہو، بلکہ طبعاً گرانی ہو، حدیث: اسباغ الوضوء على المكاره، اس کی نقلی دلیل ہے، جس سے دعاء مذکورہ سے زائد یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایسے ''مکارہ'' سے اجر و فضل

بڑھ جاتا ہے، اور عقلی حقیقت اس کی یہ ہے کہ طاعات بعض کے لئے مثل ''غذا'' کے ہیں، اور بعض کے لئے مثل ''دوا'' کے، اور ظاہر ہے کہ ''دوا'' کا نافع ہونا اس کی رغبت پر موقوف نہیں ہے، نیز ایسی حالت میں اس کا استعمال اور زیادہ ہمت اور مجاہدہ ہے، اور اس میں حکمتیں بھی ہوتی ہیں، جیسے عجب سے حفاظت، اور اپنے نقص کا مشاہدہ ونحوہما، پس عبد کامل کا مذہب یہ ہونا چاہئے''

بدرد و صاف تراحکم نیست دم درکش
که آنچه ساقی ماریخت عین الطاف ست

(انفاس عیسیٰ : ۱۹۵)

ذوق وشوق محمود ہیں، اخلاص مطلوب ہے

اس ملفوظ میں حضرت والا نے بڑا عجیب اصول بیان فرمادیا ہے، اس میں بہت سے لوگ گمراہ اور پریشان ہوجاتے ہیں، وہ یہ کہ: عبادت میں ذوق وشوق اور ولولہ، یہ نہ تو مطلوب ہے کہ آدمی اس کو اپنا مقصود بنالے کہ میرے اندر شوق اور ولولہ پیدا ہوجائے، اور جوش پیدا ہوجائے، اور نہ ہی اعمال کی قبولیت کی شرائط میں یہ بات داخل ہے کہ جب تم جوش کے ساتھ، شوق کے ساتھ عمل کروگے تب یہ عمل قبول

ہوگا، ورنہ قبول نہیں ہوگا۔ شوق کا مطلب یہ کہ نماز کے اندر آپ کو مزہ آنے لگے، اور یہ شوق پیدا ہو جائے کہ جلدی جا کر نماز پڑھوں، اگر یہ شوق و ذوق پیدا ہو جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اور اچھی بات ہے، اور محمود ہے، لیکن یہ شوق مقصود بالذات نہیں، اور نہ ہی عمل کی قبولیت کے لئے شرط ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرمائیں گے کہ تو نے جو نماز پڑھی تھی وہ ذوق و شوق کے بغیر پڑھی تھی، لہٰذا تیری نماز قبول نہیں۔ اس لئے کہ نماز کی قبولیت کے لئے ''اخلاص'' شرط ہے، لہٰذا اگر عمل ''اخلاص'' کے ساتھ ہو، اور سنت کے مطابق ہو، بس یہ دو چیزیں اگر عمل کے اندر پائی جائیں گی تو مقصود حاصل ہو جائے گا، اور انشاء اللہ وہ عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوگا، چاہے وہ عمل کتنی ہی مشقت کے ساتھ کیا تھا، اور اس عمل کے کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا، سستی ہو رہی تھی، لیکن آپ نے یہ سوچا نماز تو فرض ہے، جو مجھے پڑھنی ہے۔ یہ سوچ کر بلا شوق اور ذوق کے زبردستی اپنے اوپر جبر کر کے نماز سنت کے مطابق پڑھ لی، چونکہ ''اخلاص'' تھا، اور سنت کے مطابق وہ نماز تھی، اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہوگی۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرمائیں گے کہ چونکہ تم نے طبیعت کی گرانی اور بدشوقی کے ساتھ نماز پڑھی، اس لئے تمہیں سزا ملنی چاہئے۔ اس لئے کہ یہ چیز نہ مقصود ہے، اور نہ ہی شرائط قبول میں سے ہے۔

میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے

البتہ نماز کے اندر ذوق و شوق اور ولولہ محمود ہے، اور اس کی دلیل حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث ہے کہ جس میں آپ نے فرمایا:

جُعِلَتْ قُرَّةُ عِيْنِىْ فِى الصَّلَاةِ

یعنی میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کے اندر وہ لطف اور وہ کیف محسوس ہوتا تھا جو دنیا کی کسی اور چیز میں محسوس نہیں ہوتا تھا، یہ بات آپ کو حاصل نہیں تھی، لیکن آپ نے دوسروں سے یہ نہیں فرمایا کہ جب تک نماز کے اندر تمہیں وہ کیفیت حاصل نہیں ہوگی جو کیفیت مجھے حاصل ہوتی ہے، اس وقت تک تمہاری نماز قبول نہیں ہوگی، بلکہ آپ نے دوسروں سے فرمایا کہ:

"صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ"

جس طرح تم مجھے نماز پڑھتا ہوا دیکھتے ہو اس طرح نماز پڑھ لو، بس تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

بلا شوق والا عمل ثواب میں بڑھ جاتا ہے

بعض لوگ اس فکر میں بہت زیادہ پڑے رہتے ہیں کہ نماز میں مزہ نہیں آتا، ذوق و شوق پیدا نہیں ہوتا۔ تو بھائی! مزہ مطلوب ہی کہاں ہے؟ مطلوب اور مقصود تو اللہ کی رضا ہے، اگر وہ حاصل ہو رہی ہے تو پھر مطمئن ہو جاؤ، بلکہ حضرت فرماتے ہیں کہ: بعض اوقات اجر کے اعتبار سے وہ شخص بڑھا جاتا ہے جس نے عبادت کا کوئی عمل ناگواری اور مشقت کے ساتھ کیا، اور اس کو اس عمل میں مزہ بالکل نہیں آیا، دوسرے شخص کے مقابلے میں جس کو عبادت میں بہت مزہ آیا، اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِسْبَاغُ الْوَضُوْءِ عَلَى الْمَكَارِهِ ...... فَذٰلِكُمُ الرِّبَاطُ

یعنی جو شخص اس وقت پورا اچھی طرح وضو کرے جس وقت وضو کرنا طبیعت پر بہت شاق اور گراں ہو رہا ہو، اس کو جہاد کا ثواب ملتا ہے، مثلاً سخت سردی اور جاڑے کا موسم ہے، برف گر رہی ہے، پانی بہت ٹھنڈا ہے، گرم پانی کا کوئی انتظام نہیں، نماز کا وقت آچکا ہے، اس وقت میں ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے، لیکن جو شخص اس مشکل کے باوجود اللہ کا حکم سمجھ کر وضو کرے تو یہ ایسا عمل ہے جیسے جہاد میں رات کو سرحد پر پہرا دینا۔ اب بتایئے! اس وضو کے اندر اس کو کب مزہ آیا؟ معلوم ہوا کہ دل کی گرانی کے ساتھ عمل کرنے میں بعض اوقات ثواب بڑھ جاتا ہے، اس عمل کے مقابل میں جس کو شوق اور ذوق کے کے ساتھ کیا ہو، اس لئے کہ ذوق وشوق والے عمل میں تکلیف اور مشقت نہیں ہوتی۔

جس کو نماز میں مزہ نہ آئے اس کو مبارک باد

اسی لئے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ''میں اس شخص کو مبارک باد دیتا ہوں جس کو ساری عمر نماز پڑھنے میں مزہ نہیں آیا، لیکن پھر بھی اللہ کا حکم بجالانے کی خاطر نماز پڑھتا رہا'' اس لئے کہ اگر نماز میں مزہ آجائے، یہ اچھی بات تو ہے، لیکن اس میں خطرہ بھی ہے، وہ یہ کہ ہوسکتا ہے کہ وہ مزہ کی خاطر نماز پڑھ رہا ہو، اللہ کی رضا کے لئے نماز نہ پڑھ رہا ہو۔ لہٰذا اس بات کا اندیشہ ہے کہ ''اخلاص'' مفقود ہو جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب نماز کے اندر مزہ زیادہ آنے لگتا ہے تو آدمی کے اندر عجب پیدا ہونے لگتا ہے، اور یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ

''میں تو اس مقام تک پہنچ گیا'' اور خود پسندی کے اندر مبتلا ہو جاتا ہے کہ میں تو اب بزرگی کے اعلیٰ مقام تک پہنچ گیا ہوں، اور اللہ والا بن گیا ہوں کہ یہ عبادات اب میری طبیعت ثانیہ بن گئی ہیں۔ یہ برائیاں انسان کے اندر اس مزہ کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہیں، اور جس بیچارے کو نماز میں مزہ ہی نہیں آ رہا ہے اس کے دل میں یہ خیالات کہاں سے آئیں گے، اس کو تو یہ فکر ہو گی کہ کہیں میری نماز میرے منہ پر نہ ماردی جائے۔

ریٹائرڈ شخص کی نماز

ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑی پیاری مثال دیا کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ لوگ ''کیفیات'' کو ''روحانیت'' سمجھتے ہیں، یعنی عبادت میں شوق، ذوق، لطف اور مزہ آ رہا ہو تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ ''روحانیت'' زیادہ ہے۔ یہ سب باتیں غلط ہیں، بلکہ جس عبادت میں جتنی زیادہ سنت کی اتباع ہو گی، اتنی ہی روحانیت زیادہ ہو گی۔ ان کیفیات کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر ایک مثال دیتے ہوئے فرماتے تھے کہ دو آدمی ہیں، ان میں سے ایک ریٹائرڈ ہے، اور ملازمت سے بالکل فارغ ہے، فارغ زندگی گزار رہا ہے، اور پنشن جاری ہے، اور اس پنشن سے اچھی طرح گزارا ہو رہا ہے، اولاد بھی کما رہی ہے، بچوں اور بچیوں کی شادی کر کے فارغ ہو گیا ہے، اب اس کو کسی چیز کی کوئی فکر نہیں ہے، آرام سے گھر میں فراغت کی زندگی گزار رہا ہے، وہ شخص یہ کرتا ہے کہ اذان سے پہلے ہی وضو کر کے تیار ہو گیا، اور اذان ہوتے ہی مسجد کی طرف روانہ ہو گیا، اور صف اول میں پہنچ

گیا، اور وہاں پہنچ کر اس نے تحیۃ المسجد کی نوافل ادا کیے، اور پھر سنتیں ادا کیں، اور نماز کے انتظار میں بیٹھا ذکر کرتا رہا، اور جب جماعت کھڑی ہوئی تو بڑے اطمینان کے ساتھ خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کی، اور پھر اطمینان سے گھر واپس آ گیا، اور دوسری نماز کے انتظار اور اس کی تیاری میں لگ گیا۔

ٹھیلے پر سامان بیچنے والے کی نماز

دوسرا آدمی ٹھیلے پر اپنا سامان بیچ کر اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ہے، سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر آواز لگا کر اپنا سامان فروخت کرتا رہتا ہے، گھر میں دس افراد کھانے والے ہیں، ہر وقت اسی فکر میں لگا رہتا ہے کہ کسی طرح میرا سامان فروخت ہو جائے تو کچھ پیسے کما کر بچوں کی روٹی کا بندوبست کروں۔ اسی حالت اذان ہوگئی، اب گاہک اس سے سامان خرید رہے ہیں، ایک کو کچھ دے رہا ہے، دوسرے کو کچھ دے رہا ہے، لیکن اس کا دماغ اس طرف لگا ہوا ہے کہ اذان ہو چکی ہے، اور مجھے نماز پڑھنی ہے، اب وہ اپنے گاہکوں کو جلدی جلدی نمٹا رہا ہے، جب بالکل عین جماعت کا وقت ہو گیا تو اس وقت اس نے جلدی سے ٹھیلے کو ایک طرف کھڑا کیا، اور اس کے اوپر کپڑا ڈالا، اور بھاگتا ہوا مسجد میں پہنچا، اور جلدی جلدی وضو کیا، اور جماعت میں شامل ہو گیا، اب اس وقت اس کا دل کہیں ہے، دماغ کہیں ہے، اور یہ خیال آرہا ہے کہ کہیں کوئی چور ٹھیلا نہ لے جائے، کوئی سامان چوری نہ کر لے، اب اپنی طرف سے اس نے نماز کے اندر دل لگانے کی کوشش کر لی، لیکن ایسے حالات میں نماز پڑھ رہا ہے کہ ان خیالات کی طرف سے دماغ کو

خالی کرنا مشکل ہے، لیکن بہرصورت، اس نے سنت کے مطابق نماز پڑھ لی، اور پھر جلدی سے سنتیں ادا کیں، اور سلام پھیر کر سیدھا اپنے ٹھیلے پر پہنچ گیا، اور کپڑا اہٹایا، اور پھر آوازیں لگانا شروع کر دیں، اور سامان بیچنا شروع کر دیا۔

روحانیت کس کی نماز میں زیادہ ہے؟

حضرت فرماتے ہیں کہ بتاؤ! ان دونوں میں سے کس کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے؟ بظاہر تو یہ نظر آ رہا ہے کہ پہلا آدمی جو ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہے، جس نے بڑے اطمنان اور سکون سے نماز ادا کی تھی، اس کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے، لیکن حقیقت میں دوسرا آدمی جو ٹھیلا لگا کر اپنا سامان فروخت کرتا تھا، اس کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے۔ اس لئے کہ پہلے آدمی کو تو کوئی کام ہی نہیں تھا، اس لئے اس نے اپنے آپ کو نماز کے لئے اور عبادت کے لئے فارغ کر لیا تھا، لہٰذا نماز پڑھنا اس کا کوئی کمال نہیں تھا، بلکہ کمال تو اس ٹھیلے والے کا ہے کہ اس کے گھر میں دس افراد کھانے والے تھے، ان کے لئے روزی کمانی تھی، اور ٹھیلے پر گاہک سامان خریدنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے، ایسی حالت میں اذان کی آواز سن کر ٹھیلے کو ایک طرف کر کے مسجد کی طرف نماز کے لئے چلا گیا، اس کی نماز میں زیادہ روحانیت ہے، اس لئے کہ اس نے نماز کے لئے جسمانی اور ذہنی مشقت زیادہ اٹھائی، اس مشقت کی وجہ سے اس کے عمل میں روحانیت زیادہ ہے، اور اس پر اس کو اجر بھی زیادہ ملے گا۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ اگر ذوق وشوق وولولہ اور جذبہ ہوگا تب عبادت قبول ہوگی، ورنہ نہیں، یہ بات درست نہیں ہے۔

وہاں تعمیل حکم کا جذبہ دیکھا جاتا ہے

اللہ تعالیٰ کے یہاں اصل چیز جو دیکھی جاتی ہے، وہ تعمیل حکم کا جذبہ ہے کہ ہم نے بندے کو عبادت کا حکم دیا تھا، یہ بندہ عبادت ادا کرنے کے لئے ہمارے حکم کی تعمیل میں آگیا، اگرچہ حالات نے اس کے دل و دماغ کو منتشر کر رکھا ہے، لیکن چونکہ یہ اخلاص کے ساتھ آگیا، اور اس نے ہمارے حبیب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق عبادت انجام دے لی، بس اس کی عبادت قبول ہے۔ اس لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ اس ذوق وشوق کے حصول کی فکر میں مت پڑو۔

ساقی جیسے پلادے وہ اس کی مہربانی ہے

ہاں! اگر کسی کو ذوق وشوق کی یہ نعمت میسر آجائے تو اس پر بھی وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ یا اللہ! آپ نے میری اس عبادت کو آسان فرمادیا، اور مجھے عبادت میں لطف اور مزہ بھی آنے لگا، لیکن اس لطف اور مزہ کی طلب میں بہت زیادہ پڑنے کی ضرورت نہیں، چنانچہ آخر میں حضرت والا نے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر لکھا ہے کہ:

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم در کش

کہ آنچہ ساقیء ما ریخت عین الطاف ست

یعنی تجھ کو یہ حق نہیں کہ تو ساقی سے یہ مطالبہ کرے کہ مجھے صاف صاف شراب دینا، اور تلچھٹ مت دینا، بلکہ ساقی جیسی شراب بھی تجھ کو دیدے، یہ اس کی عین مہربانی ہے، اب چاہے وہ صاف صاف شراب دیدے، یا تلچھٹ دیدے،

لیکن دیدے۔اس طرح اللہ تعالیٰ سے ''عمل'' کی توفیق مانگتے رہو، جب ان کی طرف سے ''عمل'' کی توفیق ہو جائے تو یہ ان کا کرم ہے، چاہے اس ''عمل'' میں مزہ آئے یا نہ آئے، لطف آئے یا نہ آئے، بس! اس پر راضی رہو کہ عمل کی توفیق ہو رہی ہے، اس سے آگے بڑھنے کی فکر مت کرو۔

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ عبادت کے اندر شوق، ولولہ اور مزہ کا آنا مطلوب نہیں، اور عبادت کی قبولیت کی شرائط میں سے نہیں، لہٰذا اس فکر میں پڑے بغیر عبادت کو اخلاص کے ساتھ اور سنت کے مطابق کرنے کی فکر کرو، پھر اگر وہ حاصل ہو جائے تو بہت اچھا، نہ ملے تو کوئی غم نہیں۔آج بہت بڑی مخلوق اس فکر میں پریشان رہتی ہے کہ ہم نماز پڑھتے ہیں، مگر نماز میں مزہ ہی نہیں آتا۔اس کی وجہ سے پھر اپنے اعمال کی اور اپنی عبادات کی ناقدری شروع کر دیتے ہیں، ایسا نہیں کرنا چاہئے، عبادت کے اندر دو باتوں کا ہونا کافی ہے، ایک یہ کہ اخلاص ہو، دوسرے یہ کہ سنت کے مطابق ہو۔اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین،

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین

محبت طبعی یا عقلی

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک
اصلاحی مجالس : جلد نمبر ٦
مجلس نمبر : ۹۰

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

محبت طبعی یا محبت عقلی

الحمدللّٰہ ربّ العٰلمین، والعاقبة للمتقین، والصّلوٰة والسّلام علی رسوله الکریم وعلی آله و اصحابه اجمعین امابعد!

وہ آدمی مؤمن نہیں

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

''محبت عقلی یہ ہے کہ انسان اپنی طبیعت کو شریعت پر عمل کرنے کی طرف متوجہ کرے'' (انفاس عیسیٰ: ۱۹۵)

• ایک حدیث میں نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک میں (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) اس کو اس کے مال سے، اس کی جان سے، اس کی اولاد سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ یعنی جب تک یہ کیفیت پیدا نہ ہو جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی محبت انسان کے دل میں اس کے مال و اولاد سے بھی زیادہ نہ ہو جائے، یہاں تک کہ اس کی جان سے بھی سے زیادہ نہ ہو جائے، اس وقت تک آدمی مؤمن نہیں ہوسکتا، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنی بڑی بات ارشاد فرمادی۔

ایمان کے بارے میں خطرہ

جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی تو فاروق اعظم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں نے اپنا جائزہ لیا تو آپ بیشک مجھے اپنے مال سے بھی زیادہ محبوب ہیں، اپنی اولاد سے بھی زیادہ محبوب ہیں، لیکن اپنی جان سے زیادہ محبوب معلوم نہیں ہوتے، اس لئے مجھے اپنے ایمان کے بارے میں بڑا خطرہ ہوگیا ہے۔ اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینے پر مارا، اور فرمایا کہ کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کو اس کی جان، مال اور اولاد سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ اس وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: یارسول اللہ! اَلآن، یعنی اب آپ مجھے میری جان سے بھی زیادہ عزیز ہوگئے۔

مدار ایمان اللہ کی محبت یا رسول اللہ کی محبت

یہ بڑی مشکل حدیث ہے، اور ہم اور آپ کے لئے اس مقام کو سمجھنا آسان نہیں ہے، اس لئے کہ جس مقام سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ

بات ارشاد فرمائی، اور جس مقام سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اشکال کیا، اور جس مقام سے پھر وہ اشکال دور ہوا، یہ سب اتنی اونچی باتیں ہیں کہ ہماری اور آپ کی پرواز وہاں تک مشکل ہے۔ اس حدیث پر پہلا اشکال یہ ہے کہ اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی محبت کو "مدار ایمان" قرار دیا، اللہ کی محبت کو "مدار ایمان" قرار نہیں دیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی محبت کو "مدار ایمان" قرار دینا چاہئے تھا۔ اس اشکال کا جواب تو آسان ہے، وہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اللہ تعالیٰ کی محبت لازم اور ملزوم ہیں، دونوں محبتیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتیں، جب کسی کے دل میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہوگی تو لازماً اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت بھی ہوگی، کیونکہ اگر کسی کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے تو وہ محبت اللہ ہی کے لئے ہے، کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر ہمارے پاس تشریف لائے، آپ نے اللہ تعالیٰ کے احکام ہم تک پہنچائے، آپ نے ہمیں اللہ تعالیٰ سے روشناس کرایا، آپ نے ہمارا رابطہ اللہ تعالیٰ سے قائم فرمایا۔ لہٰذا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی وجہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی محبت ہے۔

ایک کی محبت دوسرے کی محبت کو مستلزم ہے

یہی وجہ ہے کہ کسی کے دل میں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے زیادہ محبت ہے، اور کسی کے دل میں یہ احساس ہوتا ہے کہ مجھے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبت ہے۔ لیکن حقیقت میں جب ایک کی محبت

ہوگی تو دوسرے کی محبت ضرور ہوگی، چنانچہ قرآن کریم میں جہاں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا ذکر ہے، وہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا بھی ذکر ہے، فرمایا: وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (سورۃ الاحزاب: ۷۱) لہٰذا اللہ تعالیٰ کی محبت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو مستلزم ہے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اللہ تعالیٰ کی محبت کو مستلزم ہے۔

حضرت رابعہ بصریہؒ اور اللہ کی محبت

حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا بڑے اونچے درجے کی تابعہ ہیں، خواتین میں جو اولیاء اللہ گزری ہیں، ان میں ان کا بڑا اونچا مقام ہے، ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی تو اس موقع پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے معاف فرمایئے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت میرے دل میں اتنی زیادہ پیوست ہے اور میں اللہ تعالیٰ کی محبت میں اتنی زیادہ مستغرق رہتی ہوں کہ اس کی وجہ سے اکثر و بیشتر اوقات میں میرا آپ کی طرف دھیان نہیں جاتا، اور آپ کی محبت مجھے اپنے دل میں زیادہ محسوس نہیں ہوتی، جتنی محبت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا کہ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ تم جو اللہ تعالیٰ کی محبت میں مستغرق رہتی ہو، وہ بھی میری ہی محبت ہے، لہٰذا اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

دونوں کی محبت کا حاصل ایک ہی ہے

پریشانی کی کوئی بات اس لئے نہیں کہ محبت کے الوان جدا جدا ہوتے ہیں،

کسی وقت اللہ تعالیٰ کی محبت کا جوش، جذبہ اور ولولہ زیادہ محسوس ہوتا ہے، اور کسی وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا جوش، جذبہ اور ولولہ زیادہ محسوس ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں ایک کی محبت دوسرے کی محبت کو مستلزم ہے۔ لہٰذا اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ میں سب سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں اس وقت تک تم مؤمن نہیں ہو سکتے، درحقیقت اس کا مطلب یہ ہے کہ یا میں محبوب ہو جاؤں یا اللہ تعالیٰ محبوب ہو جائیں، یا دونوں محبوب ہو جائیں، اس لئے کہ دونوں کی محبت کا حاصل ایک ہی ہے۔ پہلے اشکال کا تو یہ جواب ہو گیا۔

کیا ایمان غیر اختیاری ہے؟

اس حدیث پر دوسرا اشکال وہ ہوتا ہے جس میں علماء کرام بڑے حیران رہے، وہ یہ کہ اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تک میں تمہاری جان، مال اور اولاد سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں اس وقت تک تم مؤمن نہیں، اور محبت ایسی چیز ہے جو اپنے اختیار میں نہیں، اب اگر کسی کے دل میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس درجے کی نہیں تو اس کا ایمان بھی نہیں، اور جب ایمان نہیں رہا تو وہ ''کافر'' ہو گیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایمان بھی اختیاری نہ رہا، اس لئے کہ جب ''محبت'' غیر اختیاری چیز ہے اور ایمان اس ''محبت'' پر موقوف ہے تو پھر ایمان بھی اختیاری نہ رہا۔

ایک لمحہ میں یہ انقلاب کیسے آ گیا؟

تیسرا اشکال یہ پیدا ہو رہا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے آدمی جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جان قربان کرنے والے تھے، وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ مجھے اپنی جان سے زیادہ محبوب نظر نہیں آتے۔ پھر دوسرے لمحے میں جب آپ نے اپنا دست مبارک ان کے سینے پر مار کر دوبارہ وہ بات دھرائی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ "اَلآن" اب آپ سے اپنی جان سے زیادہ محبت ہوگئی، سوال یہ ہے کہ ایک لمحہ میں یہ زبردست انقلاب کیسے آ گیا؟

محبت طبعی

علماء کرام نے ان دونوں اشکالات کی مختلف توجیہات بیان کی ہیں، لیکن حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی جو توجیہ بیان فرمائی ہے، وہ بڑی عجیب وغریب ہے، فرمایا کہ محبت کی دو قسمیں ہیں، ایک محبت طبعی اور دوسری محبت عقلی۔ عام طور پر ہم لوگ جس کو "محبت" کہتے ہیں وہ "محبت طبعی" ہوتی ہے، یعنی طبیعت میں کسی چیز کے ساتھ ایسی محبت ہو جائے کہ اس کی یاد میں آدمی بے چین ہو رہا ہے، اس کا تصور لگائے بیٹھا ہے، ہر وقت اس کو یاد کر رہا ہے، اور جب اس کا تصور آتا ہے تو دل میں ایک جوش اور اُبال پیدا ہوتا ہے، یہ "طبعی محبت" ہے، جیسے باپ کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے، اگر بیٹا کہیں دور ہے تو اس کی بار بار یاد آتی ہے، اور اس سے ملنے کو دل چاہتا ہے، تو یہ جو یاد

آ رہی ہے، اور ملنے کو دل چاہ رہا ہے، اور طبیعت اس کی طرف تڑپ رہی ہے، بس یہی ''محبت طبعی'' ہے، یہ ''محبت طبعی'' غیر اختیاری چیز ہے، اس کا کوئی درجہ کسی کو حاصل ہوتا ہے، کسی کو حاصل نہیں ہوتا، کسی کو زیادہ محبت ہوتی ہے، کسی کو کم ہوتی ہے۔

محبت عقلی

دوسری قسم ہے ''محبت عقلی'' اور محبت عقلی کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ دل میں محبت کا جوش اور اُبال تو پیدا نہیں ہو رہا، لیکن جب میں سوچتا ہوں تو دماغ میں یہ بات آتی ہے کہ یہ ذات محبت کے لائق ہے، اور اس ذات سے ضرور محبت ہونی چاہئے، پھر اس محبت عقلی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اس کے حکم کی اطاعت کرتا ہے، اس کے اشاروں کو دیکھتا ہے، اور اس کی ہدایات پر چلتا ہے، اور اس کے کہنے پر عمل کرتا ہے، اسی کا نام ''محبت عقلی'' ہے۔

محبت عقلی کا نتیجہ

اسی لئے اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ:

> ''محبت عقلی یہ ہے کہ انسان اپنی طبیعت کو شریعت پر عمل کرنے کی طرف متوجہ کرے''

کیونکہ یہ شریعت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی ہے، جب میں عقل سے غور کرتا ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی شریعت واجب الاتباع ہے، اور اپنی زندگی کو اسی کے مطابق

ڈھالنا چاہئے، اور یہی شریعت میری صلاح و فلاح کی ضامن ہے۔ جب یہ اعتقاد پیدا ہوگیا تو بس ''محبت عقلی'' دل میں پیدا ہوگئی۔

محبت عقلی کی مثال

اس ''محبت عقلی'' کی مثال بلا تشبیہ یہ ہے کہ جیسے ایک آدمی بیمار ہوگیا، اب ڈاکٹر نے اس کے لئے ایک کڑوی دوا تجویز کردی، یا انجکشن لگانا تجویز کر دیا، ظاہر ہے کہ کڑوی دوا پینے کو یا انجکشن لگوانے کو دل نہیں چاہتا، بلکہ دل یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح اس انجکشن سے بچ جاؤں تو بہتر ہے، لیکن دل نہ چاہنے کے باوجود وہ شخص اس دوا کو پئے گا، البتہ اس دوا سے اس کو محبت نہیں ہے، چنانچہ جس دن ڈاکٹر اس سے یہ کہہ دے گا کہ اب اس دوا کو پینے کی ضرورت نہیں، اس دن وہ اس دوا کو پھینک دے گا، لیکن جب تک ڈاکٹر نے یہ کہہ رکھا ہے کہ تیری شفاء اس کڑوی دوا میں ہے، ورنہ تجھے شفاء نہیں ہوگی، اس وقت تک وہ بیمار اس دوا کو پیتا رہے گا۔ اب دوا سے اس بیمار کو ''محبت طبعی'' نہیں، لیکن ''محبت عقلی'' ہے، لہٰذا طبیعت میں گرانی کے باوجود اس دوا کو پی لے گا۔

یہ مثال ''محبت طبعی'' کی بلا تشبیہ کے بیان کردی ہے، اس لئے کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت دوا کی محبت کی طرح نہیں ہوا کرتی، صرف محبت عقلی اور محبت طبعی کا فرق سمجھانے کے لئے یہ مثال بیان کردی، ورنہ کہاں دوا کی محبت اور کہاں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت، دونوں کے درمیان کوئی نسبت ہی نہیں۔

غور و فکر کے نتیجے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت

بہر حال! جب آدمی یہ سوچتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرا خالق ہے، میرا مالک ہے، اس نے اپنے محبوب پیغمبر کو میری ہدایت اور رہنمائی کے لئے بھیجا، آپ نے ہماری ہدایت کے لئے کتنی مصیبتیں جھیلیں، اور کتنی پریشانیاں اٹھائیں، میرے لئے یہ شریعت لے کر آئے، میرے لئے ہدایت کا سامان فرمایا۔ تو اس غور و فکر کے نتیجے میں عقلی طور پر انسان حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہے، چاہے اس محبت میں وہ جوش اور ولولہ نہ ہو، جو جوش اور ولولہ اپنے بچے سے محبت میں ہوتا ہے، لیکن عقلی طور پر وہ یہ سمجھتا ہے کہ آپ کی ذات تمام چیزوں سے زیادہ قابل محبت ہے۔

محبت عقلی مطلوب ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ محبت کا جو درجہ مطلوب ہے اور جس کو ایمان کی شرط قرار دیا گیا ہے وہ ''محبت عقلی'' ہے کہ یہ ''محبت عقلی'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تمام چیزوں کے مقابلے میں غالب ہونی چاہئے۔ پھر حضرت والا نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کی توجیہ اس طرح فرمائی کہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ حدیث سنی کہ ''جب تک میں اس کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں، اس وقت تک وہ مؤمن نہیں'' تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ شروع میں یہ سمجھے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ''محبت طبعی'' کا ذکر فرما رہے ہیں، اور محبت طبعی اس درجے کی حاصل نہیں تھی،

اس لئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ نے اپنا اشکال پیش کیا، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک ان کے سینے پر مار کر دوبارہ وہ بات دھرائی، تب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بات سمجھ میں آئی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ''محبت طبعی'' کے بارے میں نہیں فرمارہے ہیں، بلکہ ''محبت عقلی'' کے بارے میں فرمارہے ہیں، اور وہ ''محبت عقلی'' مجھے حاصل ہے، اس لئے انہوں نے فرمایا ''اَلآن'' یعنی اب بات سمجھ میں آگئی، اور الحمدللہ اس ''محبت عقلی'' کا وہ درجہ مجھے حاصل ہے۔ یہ وہ توجیہ ہے جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی، حاصل یہ کہ مطلوب ''محبت عقلی'' ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی توجیہ

البتہ ایک توجیہ وہ ہے جو حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں جس محبت کا ذکر ہے اس کو ''محبت عقلی'' پر محمول کرنا اس حدیث کے زور کو گھٹا دیتا ہے، اس لئے کہ ''محبت عقلی'' تو یہ ہے کہ دل میں تو اس ذات سے کوئی خاص محبت نہیں ہے، لیکن دلائل سے سوچنے کے نتیجے میں محبت زبردستی کی جاتی ہے، اس لئے اس حدیث میں ''محبت طبعی'' ہی مراد ہے ''محبت عقلی'' مراد نہیں، لیکن وہ ''محبت طبعی'' مراد ہے جو نتیجہ ہوتی ہے ''محبت عقلی'' کا۔

طبعی محبت صغریٰ وکبریٰ کی محتاج نہیں

دیکھئے! ایک ''محبت طبعی'' وہ ہوتی ہے جو کسی تصنع اور تکلف کے بغیر، کسی

دلیل کے بغیر اور غور وفکر کے بغیر طبعاً انسان کے دل میں موجود ہوتی ہے، جیسے بچے سے باپ کو محبت طبعی ہوتی ہے، کیا ایسا ہوتا ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو باپ صغریٰ وکبریٰ نکال کر منطقی طور پر نتیجہ نکالتا ہے کہ یہ بچہ میرا ہے، اور ہر باپ کو اپنے بچے سے محبت کرنی چاہئے، لہٰذا مجھے اس سے محبت ہے، ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ جیسے ہی بچہ پیدا ہوتا ہے، اس سے محبت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے، یہ محبت خالصۃ محبت طبعی ہے۔

محبت عقلی کے نتیجے میں محبت طبعی

دوسری ''محبت طبعی'' وہ ہوتی ہے جو ''محبت عقلی'' کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے، یعنی پہلے ذرا سوچتا ہے، غور وفکر کرتا ہے، پھر جوں جوں وہ غور کرتا ہے تو اس غور کرنے کے نتیجے میں محبت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ لہٰذا اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی جس محبت کا ذکر ہے، وہ ''محبت طبعیہ'' ہی ہے، البتہ اس تک پہنچنے کا راستہ ''محبت عقلیہ'' ہے۔ اس لئے اگر کسی کے دل میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ''محبت طبعیہ'' پیدا نہیں ہو رہی ہے تو وہ یہ سوچے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس امت کے ایک ایک فرد پر کیا کیا احسانات ہیں، اور محبت کے اسباب پر غور کرے۔

حضور کے اندر محبت کے چاروں اسباب موجود ہیں

چنانچہ ''نشر الطیب'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ محبت کے چار اسباب ہوتے ہیں، اگر کسی سے محبت ہوتی ہے تو انہی اسباب میں سے

کسی سبب کے نتیجے میں محبت ہوتی ہے، (۱) یا تو اس کے جمالؔ کی وجہ سے محبت ہوتی ہے، (۲) یا اس کے کمالؔ کی وجہ سے محبت ہوتی ہے، (۳) یا اس کے نوال (جود وسخاوت) کی وجہ سے محبت ہوتی ہے، (۴) یا اس کے مالؔ کی وجہ سے اس سے محبت ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں یہ چاروں اسباب موجود ہیں، اور اس درجے میں موجود ہیں کہ کائنات میں کسی کے اندر بھی اس درجے میں موجود نہیں ہو سکتے، آپ کا جمالؔ تو ایسا تھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرما رہی ہیں کہ زلیخا کی سہیلیوں نے تو حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے، اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جلوہ جہاں آراء دیکھ لیا ہوتا تو ہاتھ کے بجائے اپنے سینے چیر ڈالتیں۔ اس درجہ کا آپ کا جمال تھا۔ آپ کا کمالؔ اس درجہ کا تھا کہ اس کائنات میں کسی بھی مخلوق کے لئے کمال کا وہ درجہ متصور ہو ہی نہیں سکتا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا۔ اور نوالؔ یعنی جود وسخاوت ایسی کہ پیسے کی جود وسخاوت، اموال کی جود وسخاوت، علم کی جود وسخاوت، دین کی جود وسخاوت، پوری امت چودہ سو سال سے آپ کی جود وسخاوت سے سیراب ہو رہی ہے، اور قیامت تک ہوتی رہے گی، اس لئے جب انسان ان اسباب میں غور وفکر کرے گا تو پھر وہ محبت عقلی نہیں رہے گی، بلکہ ''محبت عقلی'' رفتہ رفتہ ''محبت طبعی'' میں تبدیل ہوتی چلی جائے گی۔

ہر مسلمان کے دل میں حضور کی محبت

سچی بات یہ ہے کہ ایک مسلمان چاہے وہ کتنا ہی گیا گزرا کیوں نہ ہو،

فاسق ہو، فاجر ہو، گناہوں کے اندر مبتلا ہو، غنڈہ ہو، آوارہ ہو، لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس کے قلب کے اندر اس درجہ میں جاگزیں ہوتی ہے کہ چاہے وہ نماز نہ پڑھے، روزے نہ رکھے، فرائض سے غافل رہے، لیکن اگر کوئی شخص اس کے سامنے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کردے تو وہ لڑنے مرنے کو تیار ہو جائے گا، اور اپنی جان دیدے گا۔ چنانچہ بعض لوگوں نے جان دیدی، مثلاً غازی علم الدین ابھی کچھ عرصہ پہلے گزرا ہے، اس کے سامنے ایک شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تو اس نے اس کو قتل کر دیا، جب اس کے خلاف مقدمہ چلا تو لوگوں نے اس سے کہا کہ تم ایک مرتبہ اتنا کہہ دو کہ میں نے قتل نہیں کیا، یا کچھ تاویل کردو، اس نے جواب دیا کہ میں کیسے تاویل کروں، ساری زندگی میں ایک ہی تو عمل کیا، میرے اعمال نامہ میں تو صرف یہی ایک عمل ہے، کوئی اور عمل ہی ہے نہیں، چنانچہ اس کے خلاف مقدمہ ہوا، اور اس کو پھانسی دیدی گئی، بہر حال! اس نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اپنی جان دیدی۔

اختر شیرانی کا واقعہ

اختر شیرانی جو مشہور شاعر ہے، اور بہت آزاد قسم کا شاعر تھا، اور پینے پلانے کا عادی تھا، چونکہ اس کی شاعری مقبول تھی، اس لئے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا، ایک مرتبہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا، پینے پلانے کا شغل جاری تھا، لوگ اس کو چھیڑتے تھے، اور نشے کی حالت میں اس سے مختلف

لوگوں کے بارے میں سوال کر کے اس سے بات کہلواتے تھے، چنانچہ لوگ اس سے مختلف لوگوں کے بارے میں پوچھتے رہے کہ تمہارا فلاں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس نے جواب میں اس پر کوئی فقرہ کس دیا، فلاں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس نے اس پر کوئی فقرہ کس دیا، کبھی کسی سیاسی لیڈر کے بارے میں، کبھی کسی شاعر کے بارے میں، کبھی کسی ادیب کے بارے میں اس سے سوال کرتے رہے، وہ ہر ایک پر فقرہ کستا چلا گیا، اسی دوران کسی کمبخت نے اس سے یہ سوال پوچھ لیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اب ایک طرف تو وہ شراب کے نشے میں ہے، اور دوسری طرف ماحول ایسا بنا ہوا ہے کہ وہ ہر ایک پر فقرے کس رہا ہے، یہ سوال سنتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ جیسے ایک دم سے اس کو کرنٹ لگ گیا، اس کے ہاتھ میں ایک گلاس تھا، وہ گلاس اس سوال کرنے والے کے منہ پر پھینک کر مارا، اور کہا: کمبخت! تو مجھ سے میری زندگی کا آخری سہارا بھی چھیننا چاہتا ہے؟ میں بہت گناہ گار سہی، بہت گیا گزرا سہی، لیکن اس ذات اقدس کے بارے میں میرے لئے کوئی کلمہ قابل برداشت نہیں۔ بہر حال! ایک مسلمان کا یہ عالم ہوتا ہے، وہ چاہے کتنا ہی گیا گزرا کیوں نہ ہو، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس کے دل میں جاگزیں ہوتی ہے، یہ ''محبت'' بزی ''محبت عقلی'' نہیں ہوتی، بلکہ یہ ''محبت طبعی'' ہے، لیکن ''محبت عقلی'' کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے، اس حدیث میں یہی محبت مراد ہے۔

محبت اور چیز ہے، جوش وخروش اور

اور پھر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "محبت" اور چیز ہے، اور اس کا جوش وخروش اور چیز ہے، بعض اوقات کسی کے ساتھ محبت کا جوش وخروش زیادہ معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقی "محبت" دوسرے کی زیادہ ہوتی ہے، جیسے اولاد سے باپ کو محبت ہوتی ہے، اس محبت میں جوش وخروش زیادہ ہوتا ہے، جی چاہتا ہے کہ اس کو پیار کروں، اس کو گود میں لوں، اس کو چمٹاؤں، اس سے باتیں کروں۔ اس کے مقابلے میں باپ سے جو محبت ہوتی ہے، اس میں جوش وخروش نہیں ہوتا، کیا باپ کو چمٹانے، اس کو گود لینے اور اس کو پیار کرنے کا جوش ہوتا ہے؟ نہیں۔ معلوم ہوا کہ باپ سے جوش وخروش کا وہ انداز نہیں ہوسکتا جو بیٹے سے ہوتا ہے، لہٰذا باپ کے ساتھ جوش وخروش تو نہیں، لیکن باپ کی محبت میں بھی کمی نہیں، بلکہ بعض اوقات ماں باپ سے محبت اولاد کی محبت سے زیادہ ہوتی ہے، چنانچہ اگر کبھی دونوں محبتوں میں تعارض ہوجائے تو آدمی ماں باپ کو ترجیح دیتا ہے۔ تو محبت ماں باپ کی زیادہ ہے، اور جوش وخروش اولاد سے زیادہ ہے۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت زیادہ ہونی چاہئے، البتہ جوش وخروش کی زیادتی مطلوب نہیں،۔ بہر حال! حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے "محبت طبعی" ہی مطلوب ہے، جو محبت عقلی کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔

دونوں کا مقصود ایک ہی ہے

یہ وہ تفصیل ہے جو میں نے حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی

عبارت سے سمجھی، واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ نے بہت باریک اور بہت اونچی بات بیان فرمائی ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد حضرت شاہ صاحبؒ کی بات سے معارض نہیں ہے، بلکہ شاید دونوں کا مقصود ایک ہی ہے، اس لئے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جس کو ''محبت عقلی'' فرما رہے ہیں، اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ وہ محبت عقل و استدلال سے حاصل ہوتی ہے، لیکن وہ محبت بھی دل ہی سے ہوتی ہے، اس لئے کہ ''محبت'' کا محل ''دل'' ہی ہے، اور ''عقل'' کا محل ''دماغ'' ہے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے جو محبت ہے وہ اگرچہ عقل کے غور و فکر کے نتیجے میں حاصل ہوئی، لیکن ہے تو وہ ''محبت'' اور جب ''محبت'' ہے تو وہ دل سے ہوگی؛ اس لئے دونوں حضرات کی بات میں فرق نہیں، البتہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس محبت کی تعبیر ایسی فرمائی جو بات کو اقرب الی الفہم کر دیتی ہے، اور اس کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے، اور اس میں کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔

اہل محبت کا کلام پڑھیئے

آگے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

''محبت، درد اور دل جمعی پیدا ہونے کے لئے مثنوی معنوی و دیوان حافظ کے دو دو صفحے کا روزانہ مطالعہ کیا جائے تو نافع ہوگا'' (انفاس عیسیٰ: ۱۹۵)

بات دراصل یہ ہے کہ یہ ''محبت'' اور ''عشق'' کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اس

پر کوئی لکچر دیدیا جائے، اور وہ حاصل ہو جائے، بلکہ یہ تو ایک کیفیت ہے جو دل میں پیدا ہوتی ہے، اس کیفیت کے پیدا ہونے کے جو اسباب پیچھے بیان کئے گئے، ان میں سے ایک سبب تھا ''اہل اللہ سے تعلق'' تو جس طرح اہل اللہ سے تعلق اس کے لئے فائدہ مند ہوتا ہے، اسی طرح جو اہل محبت گزر چکے ہیں، ان کے حالات، ان کی سوانح، ان کے ملفوظات اور تعلیمات کا مطالعہ بھی انسان کے اندر محبت کے اضافے کا سبب بنتا ہے، یہ دونوں حضرات یعنی مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ صاحبِ مثنوی اور حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ صاحبِ دیوانِ حافظ یہ دونوں ایسے اہل محبت ہیں کہ ان کے سینوں میں محبت کی آگ کی بھٹی کی سلگی ہوئی تھی، ان کا جب کلام پڑھو گے تو اس سے اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہو گی، انشاء اللہ۔

حضرت خواجہ شمس الدین تبریزیؒ کی دعا

یہ محبت کیوں پیدا نہ ہو؟ اس لئے کہ یہ مثنوی جو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی ہے، یہ بڑی عجیب و غریب چیز ہے، اور یہ الہامی کتاب ہے، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کے جو شیخ تھے حضرت خواجہ شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ، یہ بڑے اونچے درجے کے اولیاء اللہ میں سے تھے، مگر اُمّی تھے، یعنی پڑھنے لکھنے کا سلسلہ نہیں تھا، ان کے دِل پر عجیب و غریب علوم وارد ہوتے تھے، اور وہ علوم مجالس میں بیان بھی کر دیتے تھے، لیکن وہ علوم مجلس کی حد تک محدود رہتے تھے، ایک دن انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ! آپ میرے قلب پر ایسے ایسے مضامین القاء فرماتے ہیں، لیکن وہ مضامین اس مجلس کی حد تک محدود رہتے ہیں، میں بالکل بے

زبان آدمی ہوں، نہ مجھ سے تصنیف ہوتی ہے، نہ تالیف ہوسکتی ہے، نہ کوئی شعر مجھ سے کہا جاسکتا ہے، اس لئے یا اللہ! مجھے ایک زبان عطا فرمادیں، جو میرے ان علوم کو لوگوں تک پہنچادے۔

شمس الدین تبریزؒ کی دعا کا نتیجہ

چنانچہ اس دعا کے نتیجے میں مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ تبریزؒ سے بیعت ہوگئے، یہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے پہلے ساری عمر کوئی شعر نہیں کہا تھا، جب یہ شیخؒ کی خدمت میں اصلاح کے لئے حاضر ہوئے، اور پھر بیعت ہوگئے، اسی پر انہوں نے بعد میں یہ شعر کہا:

مولوی ہر گز نہ شد مولائے روم

تا غلامِ شمسِ تبریزیؒ نہ شد

بہرحال! شیخ کی غلامی اختیار کی، اور ان سے بیعت ہوگئے، اور اس کے نتیجے میں حضرت کی دعا قبول ہوگئی، اور اللہ تعالیٰ نے مولانا رومی رحمۃ اللہ کو شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ کی زبان بنادیا۔ وہ اس طرح کہ بیٹھے بیٹھے اچانک مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان پر اشعار جاری ہوگئے، حالانکہ اس سے پہلے کبھی شعر نہیں کہا تھا، بس اچانک اشعار وارد ہونا شروع ہوگئے، اور ان اشعار میں عجیب وغریب علوم، معارف، قصے، کہانیاں، اسرار ورموز بیان ہونا شروع ہوگئے، یہاں تک کہ چھ دفتر اشعار سے بھر گئے، ان اشعار میں زیادہ تر حکایات اور کہانیاں بیان کی ہیں، لیکن ہر حکایت سے عجیب وغریب معانی اور معارف نکالتے ہیں، آخر

میں ایک حکایت بیان کرنا شروع کی وہ حکایت ابھی درمیان میں چل رہی تھی، بس اچانک اشعار کی آمد بند ہوگئی، آگے لکھ دیا کہ اس حکایت کو مکمل کرنا میرے بس میں نہیں، میرے اختیار میں نہیں، اللہ تعالیٰ ہی کسی بندے کو پیدا فرمائیں گے جو اس حکایت کو مکمل کرے گا۔

مثنوی کی تکمیل کس طرح ہوئی؟

اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے دکھا دیا کہ جو کچھ اشعار وجود میں آرہے تھے، یہ ہمارے القاء اور الہام سے آرہے تھے، چنانچہ اس کے بعد صدیاں گزر گئیں، کسی نے اس حکایت کو پورا نہیں کیا، آخر میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کو اس کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائی، اور ان کی زبان پر اشعار جاری ہوگئے، اور جہاں پر مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے وہ ادھوری حکایت چھوڑی تھی، وہیں سے انہوں نے وہ حکایت شروع کر کے "مثنوی" کی تکمیل فرمائی، اسی لئے وہ "خاتم المثنوی" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اس سے پتہ چلا کہ یہ کتاب "مثنوی" الہامی کتاب ہے، اور اللہ تعالیٰ نے الہام کے ذریعہ ان حضرات کے دلوں پر القاء فرمائی، اب جو شخص اس کو پڑھتا ہے، اس کے دل میں بھی اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جاتی ہے، اسی لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ اس کتاب کو پڑھا کریں، جن لوگوں کو فارسی نہیں آتی، ان کے لئے اردو میں اس کا ترجمہ چھپا ہوا ہے، اور اردو میں اس کی شروحات بھی موجود ہیں۔

دیوان حافظ اور مثنوی کی شرح

دوسری کتاب جس کو پڑھنے کے بارے میں حضرت نے فرمایا، وہ ہے ''دیوان حافظ'' یہ بھی عجیب وغریب کتاب ہے، اور عجیب بات یہ ہے کہ جن دو کتابوں کا حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ مطالعہ کرنے کو فرما رہے ہیں، ان دونوں کی شرح بھی حضرت نے اردو میں تحریر فرمائی ہے، ''مثنوی'' کی شرح ''کلیدِ مثنوی'' کے نام سے کئی جلدوں میں تحریر فرمائی ہے، اور ''دیوانِ حافظ'' کی شرح ''عرفانِ حافظ'' کے نام سے لکھی ہے۔ اب عقل حیران ہوتی ہے کہ حضرت والا کو کہاں فرصت تھی، اس کے باوجود دیوان حافظ کی شرح لکھ دی، جو شعر وشاعری کا مجموعہ ہے، اور اس کے اندر اکثر غزلیں ہیں، اور شراب کا اس میں تذکرہ ہے، لیکن اس سے مراد وہ شراب نہیں جو مٹکوں اور بھٹیوں میں کشید کی جاتی ہے، بلکہ اس سے مراد ''شراب محبت'' اور ''شراب معرفت'' ہے، اور اس کے ایک ایک شعر میں محبت اور معرفت بھری ہوئی ہے، آپ جانتے تھے کہ یہ کتاب پڑھنے والے کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرے گی، اس لئے آپ نے اس کتاب کی شرح لکھی۔

حافظ شیرازیؒ کا ایک واقعہ

اور حافظ شیرازیؒ کا معاملہ بھی عجیب تھا، اور یہ بھی اَللّٰہُ یَجْتَبِیْ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَـــاءُ میں داخل تھے۔ ان کے والد صاحب کے کئی بیٹے تھے، تمام بیٹے اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے، کوئی تعلیم حاصل کر رہا تھا، کوئی تجارت کر رہا

تھا، کوئی ملازمت کر رہا تھا، لیکن حافظ شیرازیؒ آوارہ جنگل میں گھومتے پھرتے رہتے تھے، نہ کوئی تعلیم، نہ تربیت، نہ کام کاج، نہ روزی اور نہ روزگار، ان کے والد صاحب کو ان کی طرف سے فکر رہتی تھی، اور پریشان رہتے تھے، ان کے والد حضرت خواجہ شیخ بہاؤالدین رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے، ایک مرتبہ وہ ان کے گھر تشریف لائے تو انہوں نے اپنے تمام بچوں کو اپنے شیخ کے سامنے پیش کیا، اور دعا کرائی، حضرت شیخ نے سب بچوں کو دعائیں دیں، پھر پوچھا تمہارا ایک اور بیٹا بھی تو ہے، وہ کہاں ہے؟ والد صاحب نے جواب دیا وہ تو فضول آوارہ ہے، اس کا کوئی پتہ نہیں، کہیں جنگل میں ہوگا، شیخ نے کہا اس کو تو بلواؤ، ان کے والد صاحب نے ایک آدمی کو ان کے بلانے کے لئے جنگل کی طرف بھیج دیا، اور اس نے جا کر کہا کہ شیخ گھر میں آئے ہوئے ہیں، ان سے آکر مل لو، اور دعائیں کرالو۔ چنانچہ یہ آئے، جب گھر میں داخل ہوئے اور شیخ پر نظر پڑی تو وہیں کھڑے ہو کر ایک شعر پڑھا کہ:

آنا کہ خاك را بنظر کیمیا کنند

آیابود کہ گوشۂ چشم بما کنند

یعنی وہ لوگ جو خاک کو ایک نظر میں کیمیا بنانے والے ہیں، مراد تھے حضرت خواجہ بہاؤالدین رحمۃ اللہ علیہ۔ کیا کبھی ایسا ہوگا کہ وہ اپنی آنکھ کا ذرا اشارہ ہمارے اوپر بھی کریں، مجذوبیت کے عالم میں یہ شعر پڑھا، یہ شعر سن کر حضرت شیخ بہاؤالدین رحمۃ اللہ کھڑے ہو گئے، اور ان کو اپنے قریب بلایا، اور

ان کے سر پر ہاتھ رکھا، اور کہا:

نظر کردم ، نظر کردم ، نظر کردم

یعنی جس نظر کو ڈالنے کے لئے تم کہہ رہے تھے، میں نے وہ نظر ڈال دی، اس دن کے بعد وہ آوارگی ختم کر دی، اور شیخ کی خدمت میں پڑ گئے، ان کے غلام بن گئے، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ مقام بخشا کہ بڑے بڑے لوگ ان پر رشک کرتے ہیں۔

دیوان حافظ کا ایک شعر

اس کے بعد انہوں نے دیوان حافظ لکھی، یہ ''دیوان حافظ'' عشق اور محبت سے بھری ہوئی بھٹی ہے، اگر کوئی اس کو سمجھنے والا ہو، چونکہ اس کو سمجھنے والے کم تھے، اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی شرح لکھ دی، تاکہ اگر براہِ راست سمجھ میں نہ آئے تو شرح کی مدد سے سمجھ لو کہ انہوں نے اس دیوان میں کیا کہا ہے، بظاہر تو دیکھنے میں شعر و شاعری ہے، چنانچہ ایک شعر میں وہ کہتے ہیں کہ:

بِدِہ ساقی مئے باقی که در جنت نخواهی یافت

کنارِ آب رکن آباد و گلگشتِ مصلا را

اب بظاہر تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ یہ آوارگی کا شعر ہے، اس لئے کہ اس شعر میں وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اے ساقی! جو شراب باقی رہ گئی ہے وہ بھی مجھے دیدے، کیونکہ جنت میں یہ شراب نہیں ملے گی، اور وہاں جنت میں نہ رکن آباد

کے دریا کے کنارے کا حسن نظر آئے گا، اور نہ گلگشت مصلا نظر آئے گا، اور نہ یہ شراب نظر آئے گی، لہٰذا جو کچھ دینا ہے، مجھے یہیں دنیا میں دیدو۔ اب بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے دنیا والی شراب اور دنیا کے دریا کا کنارا مراد ہے۔

اس شعر کا صحیح مطلب

لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی شرح میں لکھا ہے کہ اس شعر کے ذریعہ حافظ صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جنت میں اور ساری نعمتیں ملیں گی، لیکن جستجو اور طلب کی لذت وہاں نہیں ملے گی۔ اس لئے کہ وہاں پہنچنے کے بعد ساری لذتیں، نعمتیں حاصل ہو جائیں گی، اور محبوب کی جستجو اور طلب کی جو لذت اسی دنیا میں ہے، لہٰذا جب تک تو زندہ ہے، اس جستجو اور طلب کی لذت سے فائدہ اُٹھاتا جا، یہ کہیں نہیں ملے گی۔ حافظ شیرازیؒ اس شعر میں یہی کہنا چاہتے ہیں۔

نہ سمجھنے والا اعتراض کرے گا

بہر حال! اس طرح کے اشعار حافظ شیرازیؒ نے کہے، اب جو نادان لوگ ہیں، جو ان اشعار کو نہیں سمجھ سکے، انہوں نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ پر تنقید بھی کی کہ انہوں نے ایسی کتاب کی شرح لکھ دی جس میں شراب کا ذکر ہے، اس لئے کہ انہوں نے صاف صاف لکھ دیا کہ جو شراب جنت میں نہیں ملے گی، اب اس سے یہی دنیاوی شراب کے علاوہ اور کون سی شراب مراد ہوگی؟ ورنہ اصل شراب تو جنت میں ملے گی۔ لیکن حضرت نے اس شعر کو بھی تصوف کے معنیٰ

پہنا دئے، بات دراصل یہ ہے کہ جو آدمی نہیں سمجھتا وہ ضرور اعتراض کرے گا۔ بہرحال! یہ کتاب ایسی ہے کہ جب آدمی اس کو پڑھتا ہے، اور اس کے مضامین پر غور کرتا ہے تو اس سے بھی اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے، اس لئے حضرت والا فرمارہے ہیں کہ روزانہ دو صفحے مثنوی کے اور دیوانِ حافظ کے پڑھ لیا کرو، اس سے انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ کی محبت مں ترقی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں بھی اپنی محبت کا کوئی ذرہ عطا فرمادے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین

ہر چیز اللہ کی عطا ہے

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک

اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶

مجلس نمبر : ۹۱

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

ہر چیز اللہ کی عطا ہے

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین، والعاقبۃ للمتقین، والصّلوۃ والسّلام علی رسولہ الکریم، و علی آلہ و اصحابہ اجمعین۔ امّابعد!

یہ اعضاء اللہ کی نعمت ہیں

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

''سالک جس وقت دیکھتا ہے کہ ہمارے اعضاء نے قربِ حق میں ہماری اعانت کی ہے تو وہ اس حیثیت سے ان سے محبت کرتا ہے، اور اپنی آنکھ کی بھی رعایت کرتا ہے، اپنے دماغ کی بھی حفاظت کرتا ہے، نہ اس واسطے کہ وہ اپنی چیزیں ہیں، بلکہ اس واسطے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی چیزیں ہیں'' (انفاس عیسیٰ: ۱۹۷)

اللہ جل جلالہ کی محبت اور تعلق مع اللہ کا بیان چل رہا ہے، اس ملفوظ میں حضرت والا بیان فرما رہے ہیں کہ جب انسان کی نظر درست ہو جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ زاویہ نگاہ صحیح فرما دیتے ہیں تو اسے کائنات کی ہر چیز میں اللہ تعالیٰ ہی کا جلوہ نظر آتا ہے، اور جس چیز سے بھی محبت ہوتی ہے وہ درحقیقت اللہ جل شانہ ہی کی محبت کی بناء پر ہوتی ہے، چنانچہ فرمایا کہ ہمارے اعضاء جو اللہ جل شانہ نے ہمیں عطا فرمائے ہیں، یہ آنکھ ہے، یہ کان ہے، یہ ناک ہے، یہ ہاتھ پاؤں ہیں، محبت کرنے والے بندے کو ان اعضاء سے جو محبت ہوتی ہے وہ اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ یہ میری چیزیں ہیں، بلکہ اس وجہ سے ہوتی ہے کہ یہ اللہ جل شانہ کی عطا ہے، اس کی دی ہوئی نعمت ہے، اور ان کے ذریعہ مجھے اللہ جل جلالہ کا قرب حاصل ہوتا ہے، اس لئے ان اعضاء سے محبت ہوتی ہے۔

اپنے اعضاء سے محبت کریں، لیکن

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا شعر ہے:

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است

اُفتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

یعنی مجھے اپنی آنکھ پر ناز ہے کہ اس نے تیرا جمال دیکھا ہے، تیرا حسن دیکھا ہے، اور میں اپنے پاؤں پر ناز کرتا ہوں، اس بناء پر کہ وہ چل کر تیری گلی تک گیا ہے، اور مجھے تیری گلی تک پہنچایا ہے، اس وجہ سے مجھے ان سے محبت ہے۔ لہٰذا جو سالک اللہ جل شانہ کے راستے پر چل رہا ہو، اللہ جل شانہ کی محبت

اور اس کے ساتھ تعلق اس کے دل میں پیدا ہو رہا ہو، وہ اپنے اعضاء سے بھی محبت کرتا ہے، لیکن محبت کا عنوان مختلف ہوتا ہے، ہم اور آپ ان اعضاء سے اس لئے محبت کرتے ہیں کہ یہ ہمارے ہیں، یہ ہماری آنکھ ہے، ہماری ناک ہے، ہمارے کان ہیں، ہمارے ہاتھ ہیں، ہمارے پاؤں ہیں، اور ان اعضاء سے ہمیں فائدہ پہنچ رہا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جس شخص کو اپنی معرفت عطا فرمائی ہو، وہ بھی اپنے ان اعضاء سے محبت کرتا ہے، لیکن درحقیقت وہ اس لئے محبت کرتا ہے کہ ان اعضاء کے ذریعہ مجھے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوا، اور یہ اعضاء اللہ جل شانہ کی عطا ہے، اس لئے محبت کرتا ہے۔

غور کرو، یہ چیز کہاں سے آئی؟

ایک اور موقع پر حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے محبت اور تعلق بڑھانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کائنات کی جو چیز تمہیں اچھی نظر آئے، جس سے تمہیں راحت پہنچے، جس سے تمہیں لطف حاصل ہو، اس کے بارے میں سوچا کرو کہ یہ چیز کہاں سے آئی؟ کس نے یہ چیز بنائی؟ کس نے یہ چیز مجھے دی؟ جتنا سوچو گے، اتنا ہی اللہ تعالیٰ کی محبت میں اضافہ ہوگا، اس لئے کہ اس صورت میں کائنات کی ہر شئی میں تمہیں اللہ جل شانہ کا جلوہ نظر آئے گا، مثلاً کھانا سامنے آیا، وہ کھانا مزے دار ہے، تمہیں اچھا لگ رہا ہے، اس سے تمہیں راحت مل رہی ہے، اب تم ذرا یہ سوچو کہ یہ کھانا کہاں سے آیا؟ اور کس نے عطا کیا؟ اگر نظر تنگ ہوگی تو بس آدمی اس حد تک سوچے گا کہ گھر والوں نے یہ کھانا پکایا، اور اچھا پکایا،

بس اس حد پر آ کر ذہن بند ہو جائے گا۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ زاویہ نگاہ درست فرما دیں، اور عقل و سمجھ عطا فرما دیں تو وہ سوچے گا کہ گھر والوں میں یا باورچی میں کہاں طاقت تھی کہ وہ اتنا اچھا کھانا پکا سکتے، اور بظاہر کھانے کے اندر جو اجزاء نظر آرہے ہیں، چاہے وہ کسی جانور کا گوشت ہو، چاہے وہ سبزی اور ترکاری ہو، یا مسالے ہوں، یہ سب کہاں سے آئے؟ جب ان چیزوں میں گہری نظر ڈالو گے تو یہ نظر آئے گا کہ ہر چیز بالآخر اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور اس کی عطا ہے، ورنہ کسی انسان کی مجال نہیں کہ وہ ان چیزوں کو پیدا کر لیتا، یا ان چیزوں کو حاصل کر لیتا۔

یہ گوشت کہاں سے آیا؟

یہ گوشت جو تم مزے حاصل کرنے کے لئے کھا گئے، یہ گوشت کہاں سے آیا؟ کس نے پیدا کیا؟ اگر تم یہ جواب دو کہ پیسے دے کر بازار سے خریدا تھا، لہٰذا میں ہی اس کا سبب بنا ہوں، اور میں نے پیسے دے کر خریدا ہے، اور بازار سے لایا ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا بھی تو ہوسکتا تھا کہ تم جیب میں پیسے لئے پھرتے، اور بازار میں تمہیں گوشت نہ ملتا، اور نہ کوئی جانور ملتا، پھر کیا کرتے؟ ذرا سوچو کہ یہ جانور کہاں سے آیا؟ کس نے پیدا کیا؟ کیا کسی نے پیسے دے کر پیدا کروایا تھا؟ بلکہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور حکم کے نتیجے میں یہ جانور وجود میں آیا، اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس جانور کو تمہارے لئے حلال کر دیا، ورنہ حقیقت میں جاندار ہونے کے اعتبار سے تم اور وہ برابر تھے، تمہارے اندر بھی جان ہے، اس کے اندر بھی جان ہے، اگر تم اس کو کھانے کا حق رکھتے ہو تو وہ جانور تمہیں کھانے

کا حق کیوں نہیں رکھتا؟ اس کے اندر بھی طاقت اور قوت ہے، بلکہ بعض جانوروں میں تم سے زیادہ طاقت موجود ہے۔ اللہ جل شانہ نے اس جانور کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے، اور ایسا مسخر کر دیا کہ تم اس کی نسلوں کی نسلیں نگل گئے، لیکن وہ جانور کبھی تمہارے خلاف احتجاج نہیں کرتے کہ تم نے ہماری نسلوں کی نسلیں تباہ کر دیں، ہلاک کر دیں۔ اور پھر ان جانوروں کو ہر جگہ اس طرح پھیلا دیا کہ تم جس جگہ بھی پیسے دے کر گوشت حاصل کرنا چاہو تو بآسانی تمہیں وہاں گوشت مل جاتا ہے۔

یہ ترکاریاں اور پھل کہاں سے آئے؟

دوسری طرف نباتات اور ترکاریوں کو دیکھو، تم نے زیادہ سے زیادہ یہ کام کیا کہ ان کو حاصل کرنے کے لئے زمین میں بیج ڈالا، لیکن کیا تمہارے اندر اس کی طاقت تھی کہ اس بیج کو کونپل بنا دو؟ اور پھر اس کونپل سے پودا بناؤ؟ اور اس پودے میں ترکاریاں اُگاؤ؟ اس چھوٹے سے بیج سے کونپل پھوٹتی ہے، وہ کونپل اتنی نازک اور کمزور ہوتی ہے کہ اگر ایک بچہ بھی اس کو انگلی لگا دے تو وہ کونپل ختم ہو جائے، لیکن وہ نازک کونپل اتنی سخت زمین کا پیٹ پھاڑ کر باہر نکل رہی ہے، اللہ تعالیٰ ہی اپنی قدرت کاملہ سے اس کونپل سے زمین کا پیٹ چاک کرا رہے ہیں، اور پھر وہ کونپل پودا بن رہی ہے، اور پھر اس پودے پر کائنات کی ساری طاقتیں نچھاور ہو رہی ہیں، اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہوائیں چل رہی ہیں، اس کے اوپر سورج اپنی کرنیں نچھاور کر رہا ہے، چاند اس کے اوپر

اپنی روشنی ڈال رہا ہے، اور اس کے ذریعہ اس کی نشو ونما ہورہی ہے، پھر اس پودے پر ترکاریاں اور پھل آتے ہیں، پھر ان کو کاٹ کے بازار لایا جاتا ہے، اور بازار سے پھر وہ تم تک پہنچتے ہیں، لہٰذا کھانے کا ایک نوالہ جو تم کھا رہے ہو، اس نوالے کو تمہارے حلق تک پہنچانے کے لئے کائنات کی ساری طاقتیں گردش کر رہی ہیں، اسی بات کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: -

ابرو باد و مه و خورشید و فلك درکار نند

تا تو نانے بکف آری و بغفلت بخوری

یعنی روٹی کا ٹکڑا جو ٹکڑا تم کھا رہے ہو، اگر غور کرو گے تو یہ نظر آئے گا کہ اس میں بادل، ہوا، چاند، سورج ساری کائنات کی طاقتیں صرف ہوئی ہیں، تب جا کر یہ لقمہ تمہارے ہاتھ میں پہنچا ہے۔

کھانے میں ذائقہ کہاں سے آیا؟

جب کھانا سامنے آیا تو تم نے کہا کہ یہ اچھا باورچی ہے، اس نے بڑا اچھا کھانا پکایا، اس کو کھانا پکانے کا بڑا اچھا ڈھنگ آتا ہے۔ لیکن ذرا یہ سوچو کہ باورچی کھانا پکانے کا وہ ڈھنگ ماں کے پیٹ سے لے کر آیا تھا؟ اس باورچی کو یہ ڈھنگ کس نے سکھایا؟ ایک ہی چیز ہے، وہ ایک ملک میں ایک طریقے سے پک رہی ہے، اور دوسرے ملک میں دوسری طرح پک رہی ہے، ایک آدمی اس چیز کے اندر ایک ذائقہ پیدا کر رہا ہے، دوسرا آدمی دوسرا ذائقہ پیدا کر رہا ہے، وہ کون سی ذات ہے جو انسانوں کے دماغوں میں کھانے پکانے کی مختلف ترکیبیں

ڈال رہا ہے کہ اس طرح پکاؤ گے تو لذت زیاد حاصل ہوگی۔ کھانا کھاتے وقت اگر یہ باتیں سوچا کریں تو اس کھانے کے اندر بھی اللہ جل شانہ کا جلوہ نظر آئے گا، اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی محبت میں اضافہ ہوگا۔

یہ گلاس کا پانی کہاں سے آیا؟

جب پانی پیو تو یہ غور کرو کہ یہ پانی کا بھرا گلاس میرے پاس کہاں سے آیا؟ کس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے سمندر سے مون سون اٹھایا، جب تک یہ سمندر میں تھا، اس وقت تک وہ پانی کھارا اور کڑوا تھا، پینا چاہتے تو پی نہیں سکتے تھے۔ اور سمندر کے پانی کو کھارا رکھنے میں یہ حکمت ہے کہ بے شمار جانور سمندر کے اندر مر رہے ہیں، اگر سمندر کے پانی میں یہ نمکیات نہ ہوتیں تو اس پانی میں بدبو پیدا ہو جاتی، اس لئے اللہ تعالیٰ سمندر کے پانی کو کھارا رکھا، لیکن تمہیں پلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے سمندر سے مون سون بادل اٹھائے، اور اس مون سون بادلوں میں ایسی خودکار مشین لگی ہوئی ہے کہ پانی کی ساری نمکیات اور کڑواہٹ سمندر کے اندر رہ گئی، اور وہ پانی میٹھا بن گیا۔

تم پانی کا ذخیرہ کر سکتے تھے؟

پھر اگر اللہ تعالیٰ ہم سے یہ کہہ دیتے کہ دیکھو! ہم سمندر سے بادل اٹھا رہے ہیں، اور تمہارے لئے بارش برسا رہے ہیں، لہٰذا تم چھ مہینے کے لئے پانی کا ذخیرہ کر کے رکھ لو، چھ مہینے کے بعد دوبارہ برسائیں گے، اور تم خود اس پانی کی حفاظت کرو، کیا انسان کے بس میں یہ بات تھی کہ چھ مہینے کا پانی ذخیرہ کر کے رکھ

لیتا؟ نہیں۔ چونکہ یہ بات انسان کے بس میں نہیں تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس پانی کوخود ہی محفوظ کر دیا، چنانچہ فرمایا:

فَاَسْكَنّٰهُ فِی الْاَرْضِ (المومنون:۱۸)

یعنی یہ پانی بادل کی ''کارگوسروس'' کے ذریعہ سمندر سے اٹھ کر پہاڑوں تک جارہا ہے، اور جب پہاڑوں پر پانی برستا ہے تو وہاں پر خودکار ''فریزر'' اللہ تعالیٰ نے قائم کر دیے ہیں، چنانچہ وہ پانی ''برف'' کی شکل میں پہاڑوں پر جمع ہے، تمہیں یہ تکلیف نہیں دی کہ تم خود اس اپنے پاس ذخیرہ کر کے رکھ لو۔

اور تم نے سوچا بھی نہیں

اس کے بعد پھر اگر تم سے یہ کہتے کہ ہم نے پہاڑوں پر تمہارے لئے پانی ذخیرہ کر دیا ہے، تم وہاں سے جا کر اٹھا لاؤ۔ تم میں سے کسی کے بس میں نہیں تھا کہ پہاڑوں سے پانی لا کر استعمال کرتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے سورج کی گرمی سے اس کو پگھلایا، اور پھر دریا کی شکل بنائی، اور دریاؤں کے ذریعہ اس پانی کو ساری مخلوق تک پہنچایا، اور پھر زمین کے اندر رگوں میں پانی چلایا، تا کہ تم جہاں کہیں زمین کو کھودو، وہیں سے تمہارے لئے پانی نکل آئے، اتنے واسطوں سے تمہارے پاس یہ پانی کا ایک گلاس آیا، اور تم نے غٹا غٹ کر کے ایک دم سے پی لیا، اور اپنی پیاس بجھالی، اور کبھی تم نے سوچا تک نہیں کہ یہ پانی کہاں سے آیا تھا۔

یہ رنگا رنگ پھول کہاں سے آئے؟

اگر تم غور کرو گے تو تمہیں اللہ جل شانہ کا جلوہ اس پانی میں بھی نظر آئے

گا، اس کھانے میں بھی نظر آئے گا، بلکہ کائنات کی ہر چیز میں اللہ جل شانہ کا جلوہ نظر آئے گا، مثلاً تم باغ میں گئے، وہاں تمہیں خوبصورت اور خوشنما پھول اچھا لگا، وہ پھول دل کو بھا رہا ہے، آنکھوں کو اچھا لگ رہا ہے، بس اسی حد پر آ کر رک گئے، ارے آگے بھی غور کرو، اور یہ دیکھو یہ پھول کہاں سے آیا؟ کس ذات نے اس پھول کے اندر یہ حسن پیدا کیا؟ کس ذات نے اس کے اندر جمال پیدا کیا؟ اور یہ غور کرو کہ یہ کھاد ایک ہی ہے، پانی ایک ہی ہے، اور بیج ایک طرح کے ہیں، لیکن جب ان بیجوں کو زمین کے اندر ڈالو تو ایک بیج سے ایک طرح کا پھول نکل رہا ہے، دوسرے بیج سے دوسری طرح کا پھول نکل رہا ہے، اس طرح ساری کائنات میں اللہ تعالیٰ نے انواع و اقسام کے پھول پھیلا دئے، کون ذات ہے جو یہ پھول بوٹے پیدا کر رہا ہے؟ اور پھر اس میں غور کرو کہ وہ خود کتنا خوبصورت ہوگا جس نے یہ ساری خوبصورتیاں پیدا فرمائیں، بہر حال! جو چیز بھی اس کائنات میں ہے، وہ اسی ذات نے پیدا کی ہے، اسی نے اس کے اندر حسن و جمال ڈالا، اسی نے اس کو خوشنما بنایا، اور یہ سب کچھ اس کی عطا ہے۔

ایک دیہاتی کا قصہ

ہمارے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسی بات کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا کرتے تھے کہ ایک دیہاتی تھا، اس نے کبھی ریل گاڑی نہیں دیکھی تھی، جب پہلی مرتبہ اس نے ریل گاڑی دیکھی تو اس کو بڑا تعجب ہوا کہ اتنے بڑے جسم کو کون حرکت دے رہا ہے، کون چلا رہا ہے؟ جو اس کو

حرکت دے رہا ہے اس کے اندر بڑی طاقت ہے، چنانچہ وہ اسٹیشن پہنچا، وہاں ریل گاڑی کھڑی ہوئی تھی، اس نے دیکھا کہ ریل کا گارڈ ہاتھ میں سبز جھنڈی لئے کھڑا ہے، جب اس نے اس جھنڈی کو ہلایا تو ریل چلنی شروع ہوگئی، دیہاتی سمجھا کہ اتنی بڑی ریل کو چلانے والی سبز جھنڈی ہے، اس میں بڑی طاقت ہے، چنانچہ اس دیہاتی نے اس جھنڈی کے پاس جاکر اس کی ''ڈنڈوت'' اور پوجا شروع کردی کہ تیرے اندر بڑی طاقت ہے، تو نے اتنی بڑی ریل کو چلا دیا (''ڈنڈوت'' ہندوؤں کے ہاں عبادت کا ایک طریقہ ہے کہ جس کی عبادت کرتے ہیں اس کے پاس جاکر ہاتھ جوڑ کے کھڑے ہوجاتے ہیں، اور اس کے آگے بار بار سر جھکاتے ہیں)

ڈرائیور کی ڈنڈوت

کسی نے اس سے کہا کہ یہ تو کیا حرکت کر رہا ہے کہ ایک جھنڈی کو ''ڈنڈوت'' کرنا شروع کردی؟ اس دیہاتی نے جواب دیا کہ یہ جھنڈی بڑی طاقتور ہے کہ اتنی بڑی ریل گاڑی کو چلا دیتی ہے، اس لئے میں اس کو ''ڈنڈوت'' کر رہا ہوں، کسی نے اس سے کہا کہ جھنڈی تو کچھ بھی نہیں ہے، یہ تو محض ایک ''علامت'' ہے، دراصل گاڑی کو چلانے والا تو ڈرائیور ہے، جو گاڑی کے اندر بیٹھ کر اس کو چلا رہا ہے، وہاں انجن کے اندر جاکر اس کو دیکھ لے۔ چنانچہ یہ انجن کے پاس گیا، اور اندر گیا تو واقعۃً ایک ڈرائیور بیٹھا تھا، اس دیہاتی نے اس سے پوچھا کہ یہ گاڑی تم چلاتے ہو؟ ڈرائیور نے کہا کہ ہاں میں چلاتا ہوں، دیہاتی نے کہا

کہ تم اتنی بڑی ریل کو چلاتے ہو تو درحقیقت تم ''ڈنڈوت'' کے لائق ہو، چنانچہ اس دیہاتی نے ڈرائیور کے آگے ''ڈنڈوت'' کرنی شروع کردی، اس ڈرائیور نے کہا کہ بھائی میں تو تمہاری طرح کا ایک انسان ہوں، اور میرے اندر اتنی طاقت نہیں ہے کہ اتنی بڑی ریل کو چلا سکوں، بلکہ انجن میں جو بھاپ نظر آرہی ہے، اس کے اندر طاقت ہے اور یہ بھاپ ریل کو چلاتی ہے، اس کے اندر طاقت ہے، اس دیہاتی نے جاکر بھاپ کی ''ڈنڈوت'' شروع کردی، اور یہاں تک پہنچ کر ساری داستان ختم ہوگئی۔

بھاپ کو پیدا کرنے والا کون؟

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ''بھاپ'' تک پہنچ کر ساری داستان اس لئے ختم ہوگئی کہ وہ ''جھنڈی'' بھی آنکھ سے نظر آرہی تھی، اور وہ ''ڈرائیور'' بھی آنکھ سے نظر آرہا تھا، اور وہ ''بھاپ'' بھی آنکھ سے نظر آرہی تھی، اس وجہ سے انہی چیزوں کو سب کچھ سمجھ کر ان کی پرستش شروع کردی۔ لیکن اس دیہاتی نے یہ نہیں سوچا کہ اس بھاپ میں طاقت کہاں سے آگئی، جو اتنی بڑی ریل کو چلا رہی ہے، اس کی عقل ''بھاپ'' سے آگے نہ بڑھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ان ظاہری اسباب کو اپنا سب کچھ سمجھ کر اسی کو اپنا مائی باپ سمجھ لیا، اگر حقیقت دیکھنے والی نگاہ ہوتی تو وہ ایک قدم اور آگے بڑھتا، اور یہ سوچتا کہ اس بھاپ کو پیدا کرنے والا کون ہے؟ پھر اس کو اللہ جل شانہ کا جلوہ نظر آتا۔ بہرحال! کائنات کی کسی چیز کو بھی جب حقیقت بین نگاہ سے دیکھو گے تو اس میں

اللہ جل شانہ کا جلوہ ضرور نظر آئے گا، بس دیکھنے والی آنکھ چاہئے، اور سوچنے والا دل چاہئے۔

عمارت میں اللہ کا جلوہ

مثلاً تم نے ایک بہت شاندار بنی ہوئی عمارت دیکھی، اب تم اس کی بہت تعریف کر رہے ہو کہ یہ بہت شاندار، بہت اعلیٰ اور بہت خوبصورت عمارت ہے، لیکن یہ سوچو کہ یہ عمارت کیسے وجود میں آئی؟ اگر یہ سلسلہ آگے چلاؤ گے تو ابتداءً دیکھنے میں یہ نظر آئے گا کہ یہ ''معمار'' نے بنائی ہے، اور پھر سوچو کہ یہ معمار ایسی شاندار عمارت کیسے بنا سکتا ہے، ضرور کسی ''آرکیٹیکٹ'' نے اس عمارت کا نقشہ بنایا ہوگا، اب زیادہ سے زیادہ ''آرکیٹیکٹ'' پر نگاہ رک جائے گی۔ لیکن آگے قدم بڑھاؤ، اور یہ سوچو کہ اس ''آرکیٹیکٹ'' کے دل میں یہ خیال اور تجویز کس نے ڈالی؟ جب یہ سوچو گے تو تمہیں اس عمارت میں اللہ جل شانہ کا جلوہ کارفرما نظر آئے گا۔

سالک کو ہر قدم پر اللہ کا جلوہ

اک شاعر گزرے ہیں بہزاد لکھنوی مرحوم، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔ بڑی اچھی نعتیں کہا کرتے تھے، ان کی غزل کا ایک شعر ہے کہ:

وہ کہاں کا راہ رو ہے، اسے کیا ملے گی منزل
جسے ہر قدم پہ ہر سو تو ہی تو نظر نہ آئے

یعنی جس مسافر کو ہر قدم پر ہر سو، اے اللہ! تیرا جلوہ نظر نہ آئے، وہ کیسا

مسافر ہے، وہ کیسا راہ رو ہے، وہ کیسا سالک ہے، حقیقت میں تو ''سالک'' وہ ہے کہ جسے ہر قدم پر ہر سو اللہ تعالیٰ کا جلوہ نظر آتا ہے۔

تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

جب یہ سوچ بہت آگے بڑھ جاتی ہے تو پھر یہ نظر آنے لگتا ہے کہ اس پوری کائنات میں حقیقی اور اصل وجود تو صرف اللہ جل شانہ کا ہے، باقی سب وجود تو اس کے پیدا کئے ہوئے ہیں، اس کے تابع ہیں، اور اس پر موقوف ہیں، اسی کو ''وحدۃ الوجود'' کہہ دیتے ہیں، آپ حضرات نے ''وحدۃ الوجود'' کا لفظ سنا ہوگا، اس کی غلط تفسیریں بھی کی گئیں، اور اس کی وجہ سے لوگ گمراہیوں میں بھی مبتلا ہوئے، لیکن ''وحدۃ الوجود'' کے صحیح معنیٰ یہ ہیں کہ کائنات میں وجود حقیقی اللہ جل شانہ کے علاوہ کسی کا نہیں ہے، سارے وجود اس کے وجود کے سامنے ماند اور کالعدم ہیں، ہمارے حضرت مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے ''وحدۃ الوجود'' کا سارا فلسفہ ایک شعر میں بیان فرما دیا، فرمایا کہ:

جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

آسمان پر ساری رات تاروں کی محفل جمی رہتی ہے، ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں تارے چمک رہے ہیں، ستارہ اپنا حسن اور جلوہ دکھا رہا ہے، پورے آسمان کو گھیرا ہوا ہے، اور اس پر اپنی بزم سجائی ہوئی ہے، لیکن جب صبح کو سورج نمودار ہوا، ابھی نمودار بھی نہیں ہوا تھا بلکہ ابھی اُفق کے نیچے ہی تھا، اور

نیچے سے ہی اس نے صبح کا اُجالا پھیلایا، تو بس سارے ستارے ماند پڑ گئے، کیا وہ ستارے کہیں چلے جاتے ہیں؟ نہیں۔ موجود ہی رہتے ہیں، لیکن جب سورج کی روشنی آئی تو اس نے سارے ستاروں کو ماند کر دیا۔

صبح دم خورشید جب نکلا تو مطلع صاف تھا

اسی بات کو غالبؔ مرحوم نے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا کہ:

ہر ستارہ رات کو محفل میں مِحوِلاپ تھا
صبح دم خورشید جب نکلا تو مطلع صاف تھا

یعنی رات کے وقت ہر ستارہ بڑی ڈینگیں مار رہا تھا کہ میری روشنی اتنی تیز ہے، میری روشنی اتنی تیز ہے، لیکن صبح کو جب سورج نکلا تو مطلع صاف تھا، سارے ڈینگیں مارنے والے ستارے محو ہو گئے، اور مٹ گئے، کسی کا نشان باقی نہیں رہا، بس ایک سورج ہی تھا جو نظر آ رہا تھا۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کے جلوے کا سورج نکلتا ہے تو سارے وجودوں کے ستارے ماند پڑ جاتے ہیں، بس یہی ''وحدۃ الوجود'' ہے۔

ہر چیز اللہ کی تابع فرمان ہے

بہر حال! آدمی ذرا یہ سوچنے کی عادت ڈالے کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں، اس کے پیچھے کسی اور کا جلوہ نظر آ رہا ہے، اور وہ اللہ جل شانہ کا جلوہ ہے، چاہے کوئی عمارت دیکھے، کوئی پہاڑ دیکھے، سمندر دیکھے، دریا دیکھے، اور یا انسان کی بنائی ہوئی چیزیں دیکھے، مثلاً گاڑیاں دیکھے، ہر چیز کے پیچھے اللہ جل شانہ کا

جلوہ کارفرما نظر آئے گا، دیکھئے! اگر آپ کے سامنے ہوائی جہاز اُڑ رہا ہو، تو اب دیکھنے میں صرف ہوائی جہاز نظر آرہا ہے، نہ اس کے اندر بیٹھے مسافر نظر آتے ہیں اور نہ جہاز کو چلانے والا پائیلیٹ نظر آتا ہے، لیکن کوئی بھی اس جہاز کو دیکھ کر یہ نہیں کہتا کہ یہ جہاز خود بخود اڑا جا رہا ہے، بلکہ ہر انسان پورے یقین کے ساتھ یہ کہے گا کہ کوئی پائیلیٹ اس جہاز کو اڑا رہا ہے، اور اس جہاز میں مسافر سوار ہیں۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ حقیقت بین نگاہ عطا فرما دیں، تو یہ نظر آئے گا کہ کائنات میں جو چیز بھی جہاں بھی اور جس حیثیت میں بھی اپنا جلوہ دکھا رہی ہے درحقیقت وہ چیز اللہ تعالیٰ کی تابع فرمان ہو کر اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔

حقیقت بین نگاہ کس طرح پیدا ہوتی ہے؟

اور یہ حقیقت بین نگاہ پیدا ہوتی ہے اللہ والوں کی صحبت سے، اچھی مجلسوں میں بیٹھنے سے، جن کے دلوں میں اللہ جل شانہ کی محبت ہے، جن کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہے، ان کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے سے، ان کی باتیں سننے سے، ایسی نظر پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک عام آدمی ایک چیز کو دیکھتا ہے، اور دیکھ کر گزر جاتا ہے، لیکن جس کو اللہ والوں کی صحبت نصیب ہو، وہ جب اس چیز کو دیکھتا ہے، تو اس کے دیکھنے سے اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ حضرت والا فرماتے ہیں کہ سالک کا پہلا سبق یہ ہے کہ جو چیز بھی دیکھو، اور جو نعمت بھی تمہارے سامنے آئے، اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی صناعی کا مراقبہ کرو، پھر انشاء اللہ تعالیٰ ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کا جلوہ نظر آنے لگے گا۔ اور یہ چیز مشق سے حاصل

ہوتی ہے، جتنی مشق کرو گے، اتنی ہی اللہ تعالیٰ ایسی نگاہ عطا فرمادیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو یہ صفت عطا فرمادے، آمین۔

وہ ذات کیسی باکمال ہوگی؟

آگے حضرت والا نے ایک ملفوظ میں ارشاد فرمایا کہ:

''جس چیز سے کسی کو محبت ہو، اس میں یہ غور کرے کہ یہ کمال اس میں کہاں سے آیا؟ (ظاہر ہے کہ جس چیز سے محبت ہوتی ہے وہ کسی کمال کی وجہ سے ہوتی ہے) مسلمان کا دل فوراً جواب دے گا کہ حق تعالیٰ نے (یہ کمال) پیدا کیا تو اب دل کو یہ سمجھانا چاہئے کہ:

چه باشد آں نگار خود که بند آں نگار ها

کہ جس نے ایسی ایسی چیزیں پیدا کی ہیں، وہ خود کیا کچھ ہوگا، اور اس کے ساتھ ہی محبوب مجازی کی فنا و نیست ہونے کو بھی ذہن میں حاضر کیا جائے'' (انفاس عیسیٰ: ۲۰۰)

ہمیشہ رہنے والی ذات سے محبت کرو

یعنی دنیا میں جس شخص سے یا جس چیز سے محبت ہو رہی ہے تو یہ سوچے کہ بظاہر تو یہ چیز بڑی اچھی لگ رہی ہے، لیکن ایک وقت آنے والا ہے کہ اس کا حسن، اس کا جمال، اس کا کمال سب فنا اور ختم ہو جائے گا، لیکن وہ ذات جس کا کمال ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے، یہ وہ ذات ہے جس نے اس میں کمال پیدا

کیا، لہٰذا محبت کی حق دار یہ عارضی چیزیں نہیں ہیں، بلکہ محبت کا اصل اور حقیقی حق دار تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، جس نے یہ سارے کمالات پیدا کئے۔ اقبال مرحوم نے کہا کہ:

وہ عشق جس کی آگ بجھا دے اجل کی پھونک
اس میں مزہ نہیں تپشِ انتظار کا

یعنی جس عشق کی آگ موت کی پھونک کی وجہ سے ختم ہو جائے کہ اِدھر موت آئی اور اُدھر سارا عشق ڈھیلا پڑ گیا، اس عشق میں تپشِ انتظار کا مزہ نہیں، ہاں وہ عشق جس کی آگ کبھی بھی نہ بجھے، موت کی پھونک سے بھی نہ بجھے، جس کو موت چھوئے بھی نہیں، وہ ہے اللہ تعالیٰ کی محبت، وہ ہی عشق ہر مؤمن سے اور ہر انسان سے مطلوب ہے۔

مردہ کے ساتھ عشق مت کرو

آگے فرمایا کہ اس کے ساتھ ہی محبوب مجازی کے فنا و نیست ہونے کو بھی ذہن میں حاضر کیا جائے کہ یہ چند روز میں فنا ہو کر خاک ہو جائے گا، اس کا کمال وحسن عارضی ہے، اور حق تعالیٰ کا کمال ذاتی اور باقی:

عشق بامردہ نہ شد پائیدار
عشق را باحیؔ و قیوم دار

یعنی کسی مردہ کے ساتھ عشق پائیدار نہیں ہو سکتا، ہاں حی و قیوم کے ساتھ جو عشق و محبت ہوگی، وہ درحقیقت لازوال ہے، کبھی ختم ہونے والی نہیں۔

اللہ کی محبت سے مصائب آسان ہو جاتے ہیں

ایک ملفوظ میں حضرت نے فرمایا کہ:

''اہل اللہ کا خدا کی محبت میں یہ حال ہوتا ہے کہ تمام مصائب ان کو آسان ہو جاتے ہیں، نہ قید خانے سے ان کو تکلیف ہوتی ہے، نہ فاقے سے کلفت، ان کی تو شان یہ ہوتی ہے کہ ان کے پاس کچھ نہیں ہے، مگر خوش ہیں، کیونکہ ایک چیز ان کے پاس ایسی ہے کہ اس کے پاس ہوتے ہوئے ان کو کسی چیز کی پرواہ نہیں، وہ آغوش محبوب ہے، رضاء محبوب ہے، لذت طاعات ہے، لذت مناجات ہے، لذت قرب ہے''

(انفاس عیسیٰ:۲۰۱)

یعنی اللہ تعالیٰ جس کو اپنی محبت کا ذوق عطا فرما دیں تو پھر اگر اس کے اوپر دنیا کے مصائب اور پریشانیاں بھی آتی ہیں تو اس کے لئے یہ سب آسان ہو جاتی ہیں، ان کی وجہ سے ان کو پریشانی لاحق نہیں ہوتی، وہ اپنی جگہ مگن ہوتا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں اپنی محبت کی شمع روشن کر دی ہے، اس کے نتیجے میں سارے مصائب آسان ہو جاتے ہیں، بظاہر وہ کتنی تکلیف میں نظر آ رہا ہو، لیکن چونکہ اللہ جل شانہ کے ساتھ اس کا تعلق جڑا ہوا ہے، اس لئے اس کو کبھی پریشانی لاحق نہیں ہوتی۔

حضرت ایوب علیہ السلام اور آزمائش

حضرت ایوب علیہ السلام کیسی بیماری میں مبتلا ہوئے، اور اس بیماری میں انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعائیں بھی مانگیں، چنانچہ فرمایا:

اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ (الانبیاء:۸۳)

اے اللہ! مجھے سخت تکلیف پہنچ گئی ہے، آپ بڑے رحم فرمانے والے ہیں، مجھ پر رحم کر کے مجھ سے یہ تکلیف دور کر دیجئے۔ لیکن اس بیماری میں بھی ان کو پریشانی لاحق نہیں ہوئی، ان کا ایک صحیفہ ''صحیفہ ایوبؑ'' کے نام سے بائبل میں موجود ہے، اس صحیفے میں ان کے عجیب حالات اور مکالمے موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی آزمائش میں مبتلا کیا کہ ایک طرف تو ان کی بیماری شدید تھی جو بذات خود ایک آزمائش تھی۔ پھر ان کی مزید آزمائش کے لئے بیماری کے دوران اللہ تعالیٰ نے ان کے پاس دو فرشتے انسانوں کی شکل میں بھیجے، وہ فرشتے روزانہ ان کے پاس آجاتے، اور ان سے گفتگو کرتے، اور ان سے یہ کہتے کہ تمہیں یہ جو تکلیف پہنچی ہے یہ تکلیف تمہارے اللہ تعالیٰ کی طرف سے راندہ درگاہ ہونے کی علامت ہے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے، اس کی وجہ سے یہ تکلیف تمہیں لاحق ہوئی ہے۔

یہ بھی میرے مولیٰ کی طرف سے ہے

ان کے ہر مکالمے کے جواب میں حضرت ایوب علیہ السلام فرماتے کہ یہ بات نہیں، بلکہ جب تک میں عافیت میں تھا، وہ بھی ان کا کرم تھا، اور اب جس

حالت میں ہوں، یہ بھی ان کا کرم ہے، بس کرم کا عنوان مختلف ہے، وہ خوشی کا عنوان تھا، یہ تکلیف کا عنوان ہے، وہ خوشی بھی میرے مولیٰ کی دی ہوئی تھی، اور یہ تکلیف بھی میرے مولیٰ کی دی ہوئی ہے، وہ پورا صحیفہ اس مکالمے سے بھرا ہوا ہے، اس صحیفے کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو اس حالت میں بھی کیسی سکینت اور طمانیت عطا فرمائی تھی کہ جبکہ درد اور تکلیف میں بے چین معلوم ہو رہے تھے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور محبت کا جو رشتہ ہے، وہ اس حالت میں مزید مستحکم ہو رہا ہے، اور فرماتے کہ میں چونکہ کمزور ہوں، اس لئے اس کرم کا متحمل نہیں ہوں، اس لئے دعا کر رہا ہوں کہ اے اللہ! مجھ سے یہ تکلیف دور کر دیجئے، لیکن حقیقت میں یہ بھی ان کے کرم کا عنوان ہے۔ اور اس تکلیف کے نتیجے میں وہ میرے کتنے درجات بلند کر رہے ہوں گے، اور اس کے عوض وہ مجھے کیا انعام عطا کرنے والے ہیں، مجھے یہ معلوم نہیں۔

یہ بھی رحمت کا عنوان ہے

اسی بات کو حضرت والا اس طرح فرما رہے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کی محبت نصیب ہوگی، اور اس کو یہ محسوس ہوگا کہ میں ہر وقت اللہ تعالیٰ کی آغوش محبت میں ہوں، تو پھر تکلیف میں بھی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ کا بہت ہی عزیز دوست ہو، اور اچانک تمہاری اس سے ملاقات ہو جائے، اور وہ تم سے گلے ملتے وقت تمہیں خوب دبانا شروع کر دے، اب اس کے دبانے کے نتیجے میں تمہیں تکلیف تو ہوگی، لیکن وہ تکلیف لذیذ تکلیف ہوگی، اس لئے کہ

وہ تکلیف میرے محبوب کی طرف سے آرہی ہے، میرے دوست کی طرف سے آرہی ہے۔ یہی حالت اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی ہوتی ہے کہ جب ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی آزمائش آجاتی ہے تو وہ پریشان نہیں ہوتے، بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی میرے مولیٰ کی رحمت کا ایک عنوان ہے، لیکن چونکہ ہم کمزور ہیں، اس وجہ سے ہم اس رحمت کا تحمل نہیں کر پا رہے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ! اس تکلیف کو دور فرما دیجئے، اور رحمت کا دوسرا عنوان راحت کی شکل میں ہمیں عطا فرما دیجئے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس محبت کا کچھ حصہ ہمیں بھی عطا فرما دے، آمین۔

ایک صاحب کا خط اور پریشانی کا اظہار

ایک صاحب جو بیچارے تکلیفوں کے اندر مبتلا تھے، مختلف قسم کی پریشانیاں ان کو لاحق تھیں۔ اس قسم کے حالات ہر انسان کے ساتھ کبھی نہ کبھی پیش آتے ہی ہیں، کبھی بیماری آگئی، کبھی مالی تنگی پیش آگئی، کبھی بے روزگاری ہوگئی، کبھی گھر والے بیمار ہوگئے وغیرہ، اس طرح کی تکلیفیں ایک صاحب کو لاحق ہوئیں تو انہوں نے حضرتِ والا کو خط میں لکھا کہ حضرت! مجھے اس طرح کی مختلف تکلیفیں آج کل پیش آرہی ہیں، اور ان تکلیفوں کی وجہ سے بعض اوقات دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں کمی ہوگئی ہے، جب تک نعمتیں اور راحت و آرام میسر تھا، اس وقت تک دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت محسوس ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی ساری نعمتوں سے سرفراز فرمایا ہے، لیکن جب سے تکلیفیں آئی

ہیں، اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت اور تعلق میں کمی محسوس ہوتی ہے، ہم جیسے کمزور لوگوں کے دلوں میں ان تکلیفوں کی وجہ سے بعض اوقات شکوہ بھی پیدا ہونے لگتا ہے، اور بعض اوقات ناشکری کے کلمات بھی زبان سے نکل جاتے ہیں کہ کیا میں ہی رہ گیا تھا ان پریشانیوں کے لئے؟ مجھ پر ہی اتنی تکلیفیں کیوں آرہی ہیں؟ وغیرہ، اللہ تعالیٰ اس قسم کی ناشکری سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے، آمین۔

تکالیف کے وقت چند تدابیر

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان صاحب کے خط میں چند تدبیریں لکھی ہیں، جو ہم سب کے لئے فائدہ مند ہیں، اور یہ تدبیریں ہر اس حالت کے لئے فائدہ مند ہیں، جب کسی شخص کو کوئی تکلیف پہنچی ہو، یا پریشانی لاحق ہو، یا کوئی صدمہ لاحق ہو، یا کوئی تشویش لاحق ہو، وہ کیا تدبیریں ہیں؟ چنانچہ حضرت نے لکھا ہے کہ:

> ''توبہ و استغفار کرو، اور ہر روز پانچ سو مرتبہ کم از کم ''لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ'' کا وظیفہ مقرر کرلو، ایک ہفتہ میں یہ مصیبت دور ہو جائے گی، کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ ''لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ'' کَنْزٌ مِنْ کُنُوْزِ الْجَنَّةِ، وَدَوَاءٌ تِسْعِیْنَ دَاءً اَیْسَرُهَا الْهَمَّ، یعنی یہ کلمہ ''لاحول ولاقوۃ الا باللہ'' جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے، اور یہ نوے بیماریوں کی دوا ہے، جس

میں سے ادنیٰ بیماری غم اور حزن ہے، غرضیکہ اللہ تعالیٰ
سے تعلق پیدا کرو، اس کو علاوہ سب سے قطع نظر کرو،
کیونکہ راحت وکلفت سب اس کے ہاتھ میں ہے، اس کو
راضی کرو، انشاء اللہ وہ تمام مصائب کا انتظام فرمادیں
گے، اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ یَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ
یَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِیْلًا مَّا
تَذَكَّرُوْنَ (النمل:٦٢)

(انفاس عیسیٰ:۲۰۲)

پہلی تدبیر: توبہ واستغفار

ا۔ پہلی تدبیر اس ملفوظ میں یہ بتائی کہ "توبہ واستغفار کرو" یعنی جب انسان پر کوئی مصیبت، کوئی پریشانی آئے تو اس وقت انسان کو توبہ و استغفار کی طرف متوجہ ہونا چاہئے، کیوں؟ اس لئے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

ما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم و یعفو عن کثیر
(الشوریٰ:٣٠)

یعنی تمہیں دنیا میں جو کوئی مصیبت پہنچتی ہے، تو وہ تمہارے اپنے اعمال کی وجہ سے پہنچتی ہے، کوئی نہ کوئی عمل میں کوتاہی ہوتی ہے، کوئی گناہ ہوا ہے، کوئی معصیت ہوئی ہے، جس کی وجہ سے دنیا کے اندر تکلیف آجاتی ہے، لہٰذا جب بھی کوئی تکلیف آئے تو یہ سمجھو کہ شاید میرے کسی گناہ کا نتیجہ ہو، اس لئے پہلا کام توبہ

واستغفار کا کرو کہ یا اللہ! میں توبہ واستغفار کرتا ہوں، جو کچھ مجھ سے گناہ ہوئے ہیں، جو میری سمجھ میں آرہے ہیں، اور سمجھ میں نہیں آرہے، ان سے بھی آپ کے حضور معافی مانگتا ہوں، یہ پہلی تدبیر ہوئی۔

دوسری تدبیر: لاحول ولاقوۃ کا وِرد

۲۔ دوسری تدبیر یہ بیان فرمائی کہ روزانہ کم از کم پانچ سو مرتبہ "لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ" کا وظیفہ مقرر کرلو، کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ یہ کلمہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔ اور دوسری چیز حدیث میں یہ بیان فرمائی کہ یہ کلمہ "نوے" بیماریوں کا علاج ہے، جن میں سے سب سے ہلکی بیماری فکر اور تشویش ہے، یعنی اگر کسی کو کوئی فکر اور ہریشانی لاحق ہو، تشویش ہو تو یہ ان سب سے ہلکی بیماری ہے، جس کا یہ کلمہ "لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ" علاج ہے، لہٰذا اگر کسی کو پریشانی اور فکر لاحق ہو وہ اس کلمہ کو پانچ سو مرتبہ روزانہ پڑھنے کا معمول بنالے۔

"لَاحَوْلَ" جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے

لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کلمہ "لاحول ولاقوۃ الا باللہ" شیطان کو دور کرنے کا طریقہ ہے، اور اس کے نتیجے میں اس کلمہ کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہے، اور اس کلمہ کی قدر و قیمت کا اندازہ کون کرسکتا ہے جبکہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمادیا یہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے، اور جب جنت ناقابل تصور ہے تو اس کے خزانے کا تصور کیسے کرسکتے ہیں،

لیکن اس کلمہ کی بڑی عظیم صفات ہیں، اسی وجہ سے جب مبتدی کو تسبیحات پڑھنے کو بتائی جاتی ہیں تو ایک تسبیح اس کلمہ کی بھی بتائی جاتی ہے۔

اس کلمہ کا مطلب و معنی

اس کلمہ کے معنی کیا ہیں؟ اس کلمہ کے دو ترجمے اور دو مطلب ہو سکتے ہیں، اور دونوں ہی صحیح ہیں، ایک ترجمہ یہ کہ ''اللہ کے سوا کسی میں کوئی طاقت نہیں، اور کوئی قوت نہیں، جو بلند ہے، جس سے زیادہ بلند کوئی ذات نہیں، اور جو عظیم ہے، جس سے زیادہ عظیم کوئی نہیں'' یعنی جو طاقت و قوت ہے وہ علی و عظیم کے اندر ہے۔ اس ترجمہ کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص پریشانی کے عالم میں یہ کلمات پڑھے وہ یہ سوچتے ہوئے پڑھے کہ جو کچھ مجھے پریشانی لاحق ہوئی ہے یہ اللہ ہی کی مشیت سے لاحق ہوئی ہے، اس کائنات میں کسی کے اندر یہ طاقت اور یہ قوت نہیں تھی کہ وہ مجھے اس پریشانی میں مبتلا کرتا۔ اور پھر دوسری مرتبہ یہ سوچتے ہوئے یہ کلمات پڑھو کہ جب اس کی مشیت سے یہ تکلیف پہنچی ہے تو پھر یہ تکلیف اس کی مشیت کے بغیر دور بھی نہیں ہوگی، وہی دور کرے گا، کائنات میں کسی اور چیز کے اندر یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ اس تکلیف کو مجھ سے دور کر سکے، اگر یہ طاقت ہے تو صرف اللہ میں ہے، جو علی و عظیم ہے۔

تبصرہ کے بجائے اللہ کی طرف رجوع

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ آج کل جب کسی کو پریشانی لاحق ہوتی ہے، خواہ اجتماعی ہو، یا انفرادی ہو، عام

طور پر لوگ بیٹھ کر اس تکلیف پر تبصرے تو بہت کرتے ہیں کہ فلاں جگہ یہ ہو گیا، فلاں نے اتنا ظلم کیا، فلاں نے اتنا ظلم کیا، حضرت فرمایا کرتے تھے کہ جتنی دیر تک تم آپس میں بیٹھ کر تبصرے کرتے ہو، اس تبصرے میں وقت صرف کرنے کے بجائے وہ وقت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے میں صرف کرلو، اور یہ کہو کہ اے اللہ! یہ پریشانی ہے، جو ہم سے برداشت نہیں ہو رہی ہے، آپ اپنے فضل و کرم سے اس پریشانی کو دور فرما دیجئے، اور اس پریشانی کے آنے میں ہماری جن غلطیوں کو دخل ہو، اے اللہ! ہمیں ان غلطیوں کی اصلاح کی توفیق عطا فرما دیجئے۔ جب یہ عمل کرو گے تو کم از کم دعا کرنے کا ثواب تو ملے گا اور کچھ پتہ نہیں اللہ کے کسی بندے کے دل سے نکلی ہوئی کون سی دعا کس وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہو جائے، اور اس کے نتیجے میں ساری پریشانیاں دور ہو جائیں۔ اس لئے تبصرے کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔

اضطراب اور بے چینی دور ہو جائے گی

اگر یہ کلمہ ''لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ'' کثرت سے پڑھا جائے، اور اس نیت سے پڑھا جائے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ اللہ کی مشیت سے ہو رہا ہے، اور اللہ کے سوا کون ہے، جو اس کو دور کر سکے؟ کوئی نہیں ہے، جب اس اعتراف کے ساتھ پڑھو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس پریشانی کے نتیجے میں دل میں جو اضطراب اور بے چینی ہے، وہ دور ہو گی۔ اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ روزانہ پانچ سو مرتبہ یہ کلمات پڑھا کرو۔

دوسرا مطلب اور معنی

ان کلمات کے دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ کسی کے اندر کوئی طاقت کوئی قوت اللہ کے دیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، لہٰذا اے اللہ! اس پریشانی کو برداشت کرنے کی طاقت اور قوت آپ عطا فرمائیں گے تب مجھے حاصل ہوگی، آپ اپنی رحمت سے مجھے یہ طاقت اور قوت عطا فرما دیں۔ جب یہ سوچ کر ان کلمات کو پڑھو گے تو انشاء اللہ ہر پریشانی زائل ہو جائے گی۔ آخر میں حضرت والا نے فرمایا:

> ''غرضیکہ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرو، اس کے سوا سب سے قطع نظر کرو، کیونکہ راحت و کلفت سب اس کے ہاتھ میں ہے، اس کو راضی کرو، انشاء اللہ وہ تمام مصائب کا انتظام فرما دیں گے''

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ پریشانی کے موقع پر حضرت والا نے تین باتیں ارشاد فرمائیں (۱) توبہ و استغفار کی کثرت (۲) اور ''لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ'' کا کثرت سے ورد، کم از کم دن میں پانچ سو مرتبہ (۳) اللہ تبارک و تعالیٰ سے تعلق اور اس کی اطاعت کا اہتمام، یہ تین کام کرنے کے نتیجے میں انشاء اللہ پریشانی اور بے چینی جاتی رہے گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

خوف اور رجا

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱/۱۸۸، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

خوف اور رجا

دونوں مطلوب ہیں

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین، والعاقبة للمتقین،
والصّلوٰة والسّلام علی رسوله الکریم،
وعلی آله و اصحابه اجمعین، امّا بعد!

گذشتہ رمضان ۱۴۲۱ھ میں "انفاسِ عیسیٰ" کے جس حصے کی تشریح کی تھی، وہ "تعلق مع اللہ اور محبت خداوندی" سے متعلق تھا، الحمد للہ بقدرِ ضرورت اس کی تشریح ہوگئی تھی، آگے ایک نیا باب شروع ہو رہا ہے، جس کا عنوان ہے "خوف و رجا" اس کے بارے میں حضرت والا کے ملفوظات یہاں پر مذکور ہیں، اللہ کے نام پر اس رمضان ۱۴۲۲ھ میں یہ باب شروع کرتے ہیں۔

ایمان "خوف" اور "رجا" کے درمیان ہے

جن باطنی اخلاق اور اعمال کا حصول انسان کے لئے ضروری اور مطلوب

ہے،ان میں "خوف ورجا" بھی ہیں، "خوف" کے معنی ہیں، "اللہ کا ڈر" کیونکہ اگر انسان کو اللہ تعالیٰ کا ڈر نہ ہو تو آدمی غفلت میں گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور "رجا" کے معنی ہیں "امید" یعنی انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کا ڈر بھی ہو، اور اللہ جل شانہ کی ذات سے اور اس کی رحمت سے امید بھی ہو، دونوں چیزیں جب ساتھ ساتھ ہوں تب ایمان کامل ہوتا ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ "الایمان بین الخوف و الرجاء" یعنی ایمان خوف ورجا کے درمیان ہے، اگر ان دونوں میں توازن صحیح ہو جائے تو ایمان کامل ہو جائے، جتنا انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کا خوف ہونا چاہئے، اتنا ہی خوف ہو، اس سے کم زیادہ نہیں ہو، اسی طرح جتنی "رجا" ہونی چاہئے، اتنی ہی رجا ہو، اس سے کم زیادہ نہیں ہو، تو اس انسان کا ایمان کامل ہے۔

خوف اور رجا دونوں کا ہونا ضروری ہے

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "خوف اور رجا" دو پَر ہیں، جن کے ذریعہ صالحین اس دنیا سے جنت کی طرف پرواز کرتے ہیں، جس طرح پرندہ اپنے پروں کے ذریعہ پرواز کرتا ہے۔ اس لئے ان دونوں کو حاصل کرنا ضروری ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ اس کے ضروری ہونے کی طرف اشارہ فرمایا ہے، چنانچہ خوف کے بارے میں فرمایا:

تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا

(السجدہ:١٦)

یعنی جو اللہ کے نیک بندے ہیں، ان کے پہلو رات کے وقت اپنے بستر سے جدا رہتے ہیں، اور اپنے پروردگار کو اس حالت میں پکارتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈر بھی رہے ہوتے ہیں اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے امید بھی رکھے ہوتے ہیں۔

رحمت کی امید اور جہنم کا خوف

پورے قرآن کریم میں آپ کو یہ نظر آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کا ذکر علیحدہ اور جہنم کا ذکر علیحدہ کہیں نہیں کیا، بلکہ جہاں کہیں جنت کا ذکر فرمایا وہیں جہنم کا ذکر بھی فرمایا، اور جہاں جہنم کا ذکر فرمایا وہیں جنت کا بھی ذکر فرمایا، مجھے اس میں کہیں استثناء نظر نہیں آیا۔ یہ اس لئے کیا تا کہ ایک مرتبہ جنت کی جھلک دکھا کر لوگوں کے دلوں میں اپنی رحمت سے امید پیدا کریں، اور دوسری طرف جہنم کی جھلک دکھا کر لوگوں کے دلوں میں اپنا خوف پیدا کریں۔ چنانچہ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

نَبِّئْ عِبَادِيْ اَنِّيْ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ وَ اَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ

(الحجر: ۴۹، ۵۰)

یعنی میرے بندوں کو بتادو کہ میں بڑا غفور رحیم ہوں، بڑی مغفرت کرنے والا اور بڑی رحمت کرنے والا ہوں، اور ساتھ میں یہ بھی بتادو کہ میرا عذاب بھی بڑا دردناک ہے، دیکھئے! دونوں باتیں ساتھ ساتھ بتادیں۔ اب رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید باندھے، اور اس کے عذاب کا

تقاضہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے ڈرے، جب انسان دونوں چیزیں ساتھ ساتھ لے کر چلے گا تو اپنا ایمان کامل کرے گا۔

کتنا خوف ہونا چاہئے؟

اگر انسان پر تنہا "خوف" طاری ہو جائے تو وہ بھی خطرناک چیز ہے، جب خوف ہی خوف طاری ہوگیا، اور "امید" بالکل نہیں ہے تو اس کے نتیجے میں ایک طرف تو زندگی اجیرن ہو جائے گی، اور دوسری "یاس" اور "ناامیدی" پیدا ہو جائے گی، وہ یہ سوچے گا کہ میرا تو کوئی ٹھکانہ نہیں، اور یہ "ناامیدی" بڑی خطرناک چیز ہے، یہ انسان کو ہلاکت میں ڈال دیتی ہے، اس لئے اگر اللہ کی عظمت کا، اس کے جلال کا، اس کے عذاب کے خوف کا استحضار اس قدر ہو جائے کہ ہر وقت وہی دماغ پر چھا جائے تو آدمی کھانے سے، پینے سے رک جائے، اور دنیا کے کام بھی نہ کر سکے، اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اللہ تعالیٰ سے خوف مانگا، لیکن کتنا مانگا؟ فرمایا:

اَللّٰهُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ مَعَاصِيْكَ

مطلق یہ نہیں کہا کہ مجھے اپنا ڈر دیجئے، بلکہ فرمایا کہ یا اللہ! اتنا خوف دیدے جو میرے اور آپ کی معصیت کے درمیان حائل ہو جائے۔ مطلق ڈر نہیں مانگا، اس لئے کہ جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا مطلق ڈر طاری ہو جاتا ہے، اور خوف کا غلبہ ہو جاتا ہے تو اس سے ان کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے، دوسری دعا میں آپ نے فرمایا:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ مَخَافَۃً تَحْجِزُنِیْ عَنْ مَعَاصِیْکَ

اے اللہ! میں آپ سے اتنا خوف مانگتا ہوں جو مجھے آپ کی معصیت سے روک دے، اس میں آپ نے قید لگا کر خوف مانگا کہ اس سے زیادہ نہیں مانگا، اس لئے کہ اگر خوف کی زیادتی کے نتیجے میں مایوسی پیدا ہو جائے تو انسان کی زندگی اجیرن ہو جائے۔

"خوف" اور "تقویٰ" میں فرق ہے

یہاں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ قرآن کریم میں بعض جگہوں پر "تقویٰ" کا لفظ بھی آیا ہے، اور بعض جگہوں پر "خوف" کا لفظ بھی آیا ہے۔ "تقویٰ" کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ (آل عمران:۱۰۲)

یعنی اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اللہ کا حق ہے۔ جبکہ "خوف" کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ اتنا خوف کرو جتنا کہ اللہ کا حق ہے، اس لئے کہ "تقویٰ" اور "خوف" میں فرق ہے، "خوف" کے معنی ہیں مطلق ڈر جس سے آدمی مرعوب ہو جائے، اور دل و دماغ پر اس کا ڈر مسلط ہو جائے، یہ ہے "خوف" جبکہ "تقویٰ" مطلق "ڈر" کا نام نہیں، بلکہ تقویٰ اس کیفیت کا نام ہے جو "خوف" کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے، یعنی یہ فکر کہ جس سے مجھے خوف ہو رہا ہے، میں اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کروں، اس کیفیت کا نام "تقویٰ" ہے، لہٰذا "خوف" نام ہے ڈر کا، اور اس ڈر کی وجہ سے گناہ سے بچنے کا نام "تقویٰ"

ہے، چنانچہ یہ ڈر کہ اللہ تعالیٰ زبردست طاقت والے ہیں، بدلہ لینے والے ہیں، اللہ تعالیٰ کا عذاب بڑا شدید ہے، اس نے ایسی جہنم تیار کر رکھی ہے، اس تصور کے بعد جو ڈر پیدا ہو رہا ہے اس کا نام ہے "خوف" اور اس ڈر کی وجہ سے اگر تم جھوٹ بولنے سے بچ گئے تو اس کا نام "تقویٰ" ہے، اگر اس ڈر کے نتیجے میں تم غیبت سے بچ گئے بدنظری سے بچ گئے تو اس کا نام "تقویٰ" ہے۔

ناسخ اور منسوخ

بعض حضرات علماء یہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی یہ جو آیت ہے کہ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (آل عمران: ۱۰۲) یہ آیۃ منسوخ ہو گئی ہے، اور اس آیۃ کا ناسخ دوسری آیۃ ہے، فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (التغابن: ۱۶) یعنی پہلے یہ حکم آیا تھا کہ جیسا اللہ تعالیٰ کا حق ہے ویسا تقویٰ اختیار کرو، یہ حکم سن کر صحابہ کرام کو بڑی پریشانی ہوگئی کہ یا اللہ! ہم تقویٰ کا حق کیسے ادا کر سکتے ہیں؟ ہمارے بس میں نہیں ہے کہ ہم اللہ کے تقویٰ کا حق ادا کریں، صحابہ کرام کی اس پریشانی کے بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا، اور پھر یہ آیۃ نازل ہوئی فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (التغابن: ۱۶) یعنی اتنا تقویٰ اختیار کرو، جتنا تمہاری استطاعت میں ہو۔ لہٰذا اب "حَقَّ تُقٰتِہٖ" کا مطالبہ باقی نہیں رہا۔

پہلی آیۃ دوسری آیۃ کی تفسیر ہے

لیکن دوسرے اہل علم یہ کہتے ہیں کہ ان آیات کو ناسخ اور منسوخ کہنے کی

ضرورت نہیں، بلکہ درحقیقت پہلی آیۃ دوسری آیۃ کی تفسیر ہے، یعنی جب یہ کہا گیا کہ جیسا اللہ کا حق ہے ویسا تقوی اختیار کرو، اس وقت صحابہ کرام ڈر گئے کہ تقوی کا حق ہم سے کہاں ادا ہوگا؟ تو ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیۃ نازل فرمائی کہ تقوی کا حق اتنا ہی ہے جتنی تمہارے اندر طاقت ہے، ہم نے تم سے تقوی کا بہت اونچا مطالبہ نہیں کیا، بلکہ ''حَقَّ تُقٰتِہٖ'' سے مراد ''مَا اسْتَطَعْتُمْ'' ہی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی استطاعت سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتے ''لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا'' لہٰذا یہ دوسری آیۃ پہلی آیۃ کی تفسیر ہے۔

''احیاء العلوم'' کا باب الخوف

خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ اتنا ''خوف'' مطلوب نہیں جس کے نتیجے میں آدمی کے اندر ''مایوسی'' پیدا ہو جائے، اور ''تقوی'' اتنا مطلوب ہے جو استطاعت کے مطابق ہو۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''احیاء العلوم'' بڑی زبردست کتاب ہے، ہر چیز کے اندر اس کی عجیب شان ہے، لیکن میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ اس کتاب کا باب الخوف ایک مجلس میں پورا نہیں پڑھنا چاہئے، بلکہ مختلف مجلسوں میں تھوڑا تھوڑا پڑھنا چاہئے، اس لئے کہ اگر کوئی شخص پورے باب کو ایک مجلس میں پڑھے گا تو بعض اوقات پڑھنے والے پر ''خوف'' کا اتنا غلبہ ہو جائے گا جو مطلوبہ خوف سے بڑھ جائے گا، چنانچہ اس باب کو پڑھنے کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کے حالات خراب ہو گئے، ان کے ذہن اُلٹ گئے، اور وہ مایوسی کی طرف چل پڑے، یہ

تفصیل تو ''خوف'' کے بارے میں تھی۔

''امید'' میں حد اعتدال مطلوب ہے

دوسری چیز ''رجا'' ہے، جس کے معنی ہیں ''امید''۔ یہ ''امید'' بھی مطلوب ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید رکھنا مطلوب ہے، لیکن یہ ''امید'' بھی اعتدال کے اندر ہو، اگر ''امید'' اعتدال سے بڑھ جائے تو اس کا نام ''دھوکہ'' اور ''غرور'' ہے، ''امید'' اعتدال سے کس طرح بڑھ جاتی ہے؟ اس کے بارے میں ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَلْعَاجِزُ مَنْ اِتَّبَعَ نَفْسَہٗ ھَوٰھَا وَتَمَنّٰی عَلَی اللّٰہِ

یعنی ''عاجز'' وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو ''خواہشات'' کے پیچھے لگائے ہوئے ہے، اس کی نفسانی خواہشات اس کو جہاں لے جارہی ہیں، وہ جارہا ہے، گناہ کرنے میں کبھی کوئی کھٹک نہیں ہوتی، گناہوں سے بچنے کا کوئی اہتمام نہیں، دل میں جو خواہش پیدا ہورہی ہے، اس کو پورا کررہا ہے، حلال حرام ایک کررہا ہے، ساتھ میں اللہ تعالیٰ پر آرزو باندھے بیٹھا ہے، چنانچہ جب اس کو یہ کہا جائے کہ یہ کام ناجائز ہے تو جواب میں کہتا ہے کہ اللہ بڑا غفور رحیم ہے، اس شخص کو ''غفور رحیم'' ہونے کا دھوکہ ہوگیا ہے، یہ ''رجا'' نہیں، اس لئے کہ جب ''امید'' اپنی حد سے آگے بڑھ جائے تو وہ غرور اور دھوکہ بن جاتا ہے۔ لہٰذا ''رجا'' کو اپنی حد پر رکھنا چاہئے، تاکہ یہ دھوکہ نہ بنے، اور ''خوف'' کو اپنی حد میں رکھنا چاہئے، تاکہ وہ ''یاس'' اور ''ناامیدی'' میں تبدیل نہ ہوجائے، دونوں کو اپنی

اپنی حد پر رکھ کر چلنا چاہئے۔

دونوں کی حد اعتدال کس طرح معلوم ہو؟

اب سوال یہ ہے کہ انسان ان دونوں کو اپنی اپنی حد پر رکھ کر کس طرح چلے؟ کون شخص یہ بتائے گا کہ یہ "خوف" اپنی حد کے اندر ہے، اور یہ "رجا" اپنی حد کے اندر ہے؟ اور کون بتائے گا کہ تمہیں "خوف" کا مطلوبہ درجہ حاصل ہے، اور "رجا" کا بھی مطلوبہ درجہ حاصل ہے؟ یہ پتہ لگانے ہی کے لئے "فن تصوف" ہے، اور یہ پیری مریدی اس کام کے لئے ہے، اور شیخ سے رجوع اسی مقصد کے لئے کیا جاتا ہے، وہ شیخ بتاتا ہے کہ "خوف" کا وہ درجہ جو مطلوب ہے وہ الحمد للہ تمہیں حاصل ہو چکا ہے، اور جتنی "رجا" مطلوب تھی، اللہ تعالیٰ نے وہ تمہیں عطا فرمادی، اور تم اعتدال کے اندر ہو، اور اگر کوئی شخص اعتدال کی حد کے اندر نہیں ہے تو شیخ اس کی اصلاح کر کے اس کو اعتدال کی حد کے اندر لاتا ہے، تصوف کا اور کسی شیخ سے رجوع کرنے کا اصل مقصود یہی ہے۔ آج کل لوگوں نے "تصوف" کا مقصد یہ سمجھ لیا ہے کہ شیخ کچھ تسبیحات پڑھنے کو بتا دے گا کہ صبح یہ پڑھا کرو، اور شام کو یہ پڑھا کرو، یاد رکھئے! یہ تسبیحات اصلاح کے اندر معاون ضرور ہیں، لیکن اصل مقصود نہیں، تسبیح تو آپ شیخ کے بغیر گھر میں بیٹھ کر بھی پڑھ سکتے ہیں۔ لہٰذا تصوف کا اور شیخ سے تعلق کا اصل مقصود یہ ہے کہ جو اعمال باطنہ مقصود ہیں وہ انسان کے اندر پیدا ہو جائیں، اور جن اعمال سے بچنا ضروری ہے انسان ان سے بچ جائے۔ بہر حال! حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں "خوف"

اور ''رجا'' دونوں بیان کو بیان کیا ہے، تا کہ ہم دونوں کے درمیان رہتے ہوئے زندگی گزاریں۔

مایوس اور نا امید ہونا جائز نہیں

چنانچہ ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

''نا امیدی عقلی مذموم ہے، یعنی اگر یہ اعتقاد ہو جائے کہ مجھ پر ہرگز رحمت نہ ہوگی، اور میری موجودہ حالت ایسی نہیں کہ اس پر رحمت ہو'' (انفاس عیسیٰ: ۲۰۴)

اگر کسی کے دماغ میں یہ بات بیٹھ جائے کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کبھی نہیں ہوگی، تو یہ ''یاس'' ہے، اسی کا نام ''نا امیدی'' ہے، یہ مذموم ہے، اور کسی مؤمن کے لئے یہ ''یاس'' جائز نہیں، ہرگز نہیں ہونی چاہئے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ،اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا

(الزمر: ۵۳)

اے میرے بندوں! جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کر رکھا ہے، اور زیادتیاں کر بیٹھے ہو، تم اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہونا، بیشک اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو معاف فرمانے والے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، چاہے انسان نے کتنا ہی بڑے سے بڑا گناہ کر لیا ہو، اور برے سے برا گناہ

کر بیٹھا ہو، تب بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کسی حال میں مایوس نہ ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ایسی ہے کہ تم نے چاہے کیسا ہی بڑے سے بڑا گناہ کرلیا ہو، ایک مرتبہ جب تم سچے دل سے توبہ کرلو گے، اور یہ کہو گے " اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّ اَتُوْبُ اِلَيْهِ " تو انشاء اللہ اسی لمحے اللہ تعالیٰ تمہیں سارے گناہوں سے پاک صاف کردیں گے، اس میں کوئی شبہ اور شک نہیں۔ لہٰذا ایک مسلمان کے دل میں مایوسی کا کہاں گزر ہوسکتا ہے۔

جس کا اللہ ہو اس کو پریشانی کیسی؟

مایوسی تو اس شخص کو ہو جس کے ساتھ یہ وعدے نہ کئے گئے ہوں، جس کو اللہ تعالیٰ نے یہ راستے نہ بتائے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے بتادیا کہ میں نے تمہارے لئے توبہ کا دروازہ کھولا ہوا ہے، اور مرتے دم تک کھلا رہے گا، پھر مایوسی کیوں؟ میرے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ:

جس کا اللہ ہو، اس کو پریشانی کیسی؟

لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے یہ وعدے فرما رکھے ہیں، اور طریقے بھی بتا رکھے ہیں، پھر کہاں کی پریشانی؟ کیسی مایوسی؟ جب گناہ کرکے پریشان ہو تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو، توبہ کرو، استغفار کرو، اور آئندہ اس گناہ سے بچنے کی فکر کرو، باقی اپنے گناہ کا مراقبہ کبھی مت کرو کہ میں نے فلاں گناہ کیا، میں نے فلاں گناہ کیا، فلاں گناہ کیا، ارے جتنا وقت تم اس مراقبہ میں گزار رہے ہو، وہ وقت "اللہ کے ذکر" میں، اور "سبحان اللہ" پڑھنے میں گزار دو، اور توبہ کرو کہ یا

اللہ! میں نے جو کچھ گناہ کئے، میں ان پر اقراری مجرم ہوں، گناہوں کا اقرار کرتا ہوں، لیکن یا اللہ! آپ کی رحمت بڑی وسیع ہے، آپ کی رحمت سے توبہ کرتا ہوں، اور استغفار کرتا ہوں۔ لہٰذا اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، یہ خیال کہ میں تو راندہ درگاہ ہوں، اور میں تو اللہ کی رحمت سے دور ہوں، اللہ کی رحمت مجھ پر ہو ہی نہیں سکتی، یہ سب شیطانی خیالات ہیں۔

ناامیدی کے غلبہ کا نتیجہ

بعض اوقات غلبہ حال کے نتیجے میں "خوف" کا یا "یاس" کا انسان پر غلبہ ہو جاتا ہے، یہ غلبہ بڑی خراب چیز ہے، اس لئے کہ اس کے نتیجے میں انسان پر قبض کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، عبادت میں دل نہیں لگتا، توبہ کی طرف توجہ نہیں ہوتی، اور دماغ میں یہی خیال سوار ہو جاتا ہے کہ میں اللہ کی رحمت سے دور ہوں۔ ایسے موقع پر شیخ کی ضرورت ہوتی ہے، اور حکمت سے کام لینا پڑتا ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ کا ایک مرید تھا، اس پر "قبض" کی کیفیت طاری ہو گئی، اور اس کے دماغ پر یہ خیال مسلط ہو گیا کہ میں شیطان ہوں، اور شیطان کے بارے میں یہ طے ہے کہ وہ جہنمی ہے، اس لئے اپنے جہنمی ہونے کا یقین ہو گیا، جس سے ملاقات ہوتی تو اس سے یہ کہتا کہ میں شیطان ہوں۔ جب ان کے شیخ کو پتہ چلا تو ان کو بلایا اور پوچھا کہ کیا بات ہے؟ کہنے لگا کہ میں تو شیطان ہو گیا ہوں، اور میں اللہ کی رحمت سے دور ہو گیا ہوں، اور اب سوائے جہنم کے میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، شیخ نے اس سے کہا کہ یہ بتاؤ شیطان کس کی مخلوق ہے؟ ارے شیطان

بھی انہی کی مخلوق ہے، انہوں نے ہی تو شیطان کو پیدا کیا ہے، پھر کیوں ڈرتا ہے؟ بس یہ سن کر اس کی گرہ کھل گئی، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی کیفیت زائل کردی۔ بہر حال! علاج کے لئے بھی شیخ کو دیکھنا پڑتا ہے کہ اس وقت اس کے لئے کیا مفید ہوگا؟ اسی لئے حضرت والا فرمارہے ہیں کہ یہ اعتقاد کہ مجھ پر ہرگز اللہ کی رحمت نہ ہوگی، یہ ناامیدی ہے، اور مذموم ہے، اس سے بچنا چاہئے۔

ناامیدی کس طرح پیدا ہوتی ہے؟

یہ ناامیدی کی کیفیت اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ جو اعمال کرنے کی اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمارہے ہیں، ان کی ناقدری کرنے سے رفتہ رفتہ یہ کیفیت پیدا ہوجاتی ہے، اکثر و بیشتر ہماری زبانوں پہ یہ رہتا ہے کہ ہماری نمازیں کیا ہیں؟ یہ تو ٹکریں مارنا ہے، یہ وقت گزاری کررہے ہیں، یہ سب ناقدری کی باتیں ہیں، یہ ناقدری نہیں کرنی چاہئے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ارے بھائی! اس عبادت کی ادائیگی کی توفیق پر پہلے شکر ادا کرلو، کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو ایسی عبادت کرنے کی بھی توفیق میسر نہیں، اس لئے جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس عبادت کو انجام دینے کی توفیق دیدی تو پہلے اس پر شکر ادا کرلو، اور یہ کہو: یا اللہ! آپ کی توفیق اور آپ کے فضل وکرم سے مجھے یہ توفیق ملی، آپ مجھے مسجد میں لے آئے، مجھ سے نماز پڑھوادی، اے اللہ! اس پر آپ کا شکر ہے۔

نماز کے بعد استغفار کرلو

شکر ادا کرنے کے بعد یہ کہو کہ یا اللہ! مجھ سے یہ نماز صحیح طور پر نہیں پڑھی

گئی، اور اس نماز کے اندر کمی کوتاہی ہوگئی، اس پر میں استغفار کرتا ہوں، لہٰذا نماز پڑھنے کے بعد "الحمدللہ" بھی کہو، اور "استغفراللہ" بھی کہو، اس کے بعد پھر اپنی نماز کی ناقدری مت کرو، اس لئے کہ یہ ناقدری رفتہ رفتہ انسان کو "مایوسی" کی طرف لے جاتی ہے، اور یہ خیال ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی عبادت کرلوں، لیکن وہ قابل قبول نہیں ہوگی، اس مایوسی سے بچو، اور جو عبادت کرنے کی توفیق ہو، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اور کہو: اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ، لہٰذا توفیق پر "شکر" اور کوتاہی پر "استغفار" کرتے رہو، ساری عمر یہ کرتے رہو، انشاء اللہ پھر "مایوسی" پیدا نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین

مخلوق کا ڈر

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک

اصلاحی مجالس : جلد نمبر ٦

مجلس نمبر : ٩٣

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

مخلوق کا ڈر
خالق کے ڈر سے زیادہ ہونا

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین، والعاقبۃ للمتقین، والصّلوٰۃ والسّلام علی رسولہ الکریم، وعلی آلہ واصحابہ اجمعین ـ اما بعد!

مخلوق سے زیادہ ڈرنا

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا کہ "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے دل میں مخلوق کا ڈر خالق کے ڈر سے زیادہ ہے" یہ حالت اکثر و بیشتر پیش آتی ہے، شاید سب کو پیش آتی ہوگی، مثلاً کسی شخص سے ایک گناہ سرزد ہوگیا، اب اس شخص کو یہ ڈر ہے کہ اگر مخلوق میں سے کسی کو اس گناہ عظیم کا علم ہو جائے گا تو بڑی بدنامی ہوگی، بڑی رسوائی ہوگی ـ اور اللہ تعالیٰ کو یہ علم ہے ہی کہ اس سے یہ گناہ سرزد ہوا ہے، اب طبعی طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

اس وقت مخلوق کا ڈر اللہ تعالیٰ کے ڈر کے مقابلے میں زیادہ محسوس ہوتا ہے۔

مخلوق کا ڈر زیادہ ہونے کی مثال

مثلاً دنیا میں انسان کو یہ ڈر ہوتا ہے کہ مجھے کوئی درندہ نہ کھالے، کوئی ظالم مجھے نقصان نہ پہنچادے، یا پولیس کا خوف ہے، جیل میں جانے کا خوف ہے، یا افسر بالا کا خوف ہے، یا دشمن کا خوف ہے، اس قسم کا خوف جب انسان پر طاری ہوتا ہے تو ایک دم سے اس کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ لیکن یہ خوف کہ اگر مجھ سے گناہ ہوگیا تو مجھے جہنم سے سابقہ پیش آئے گا، یا اللہ جل جلالہ کی ناراضگی کا سامنا ہوگا، یہ خوف دل و دماغ پر چھاتا نہیں ہے۔ مثلاً اگر گھر کے اندر ڈاکو گھس جائیں، اور گردن پر پستول رکھ کر کہیں کہ پیسے نکالو، تو اس ڈاکو سے جتنا ڈر لگے گا، گناہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے اس درجے کا یہ ڈر نہیں لگتا کہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کیسے پیش ہوں گا، کہیں اللہ تعالیٰ مجھے عذاب نہ دیدیں، کہیں مجھے جہنم میں نہ ڈال دیں، اس کا ڈر اتنا نہیں ہوتا۔ بہر حال! ان صاحب نے حضرت والا کو یہ لکھا کہ مجھے مخلوق کا خوف خالق کے خوف سے زیادہ محسوس ہوتا ہے، اس لئے کہ یہ حالت بڑی خطرناک ہے، کیونکہ قرآن کریم میں تو یہ حکم ہے کہ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ (الاحزاب: ۳۷) یعنی اللہ تعالیٰ اس بات کے زیادہ حقدار ہیں کہ انسان اللہ سے زیادہ ڈرے۔ اور مجھے مخلوق سے زیادہ ڈر لگتا ہے، واقعۃً ان صاحب نے بڑا اہم سوال کیا، اس لئے کہ مخلوق کا زیادہ ڈر کہیں ایمان کی کمزوری کی علامت تو نہیں ہے؟

طبعاً مخلوق کا ڈر زیادہ ہونا مذموم نہیں

اب حضرت والا کا جواب سنئے! آپ نے جواب میں فرمایا کہ:

"مخلوق کا ڈر خالق سے طبعاً زیادہ ہونا مذموم نہیں کہ غیر اختیاری ہے، اور عقلاً واعتقاداً زیادہ ہونا البتہ مذموم ہے، لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِنَ اللّٰهِ (الحشر:۱۳) کا بھی محمل ہے" (انفاس عیسی:۲۰۴)

یعنی یہ جو طبعی طور پر ایک آدمی کو مخلوق سے زیادہ ڈر محسوس ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ سے ڈر کم محسوس ہو رہا ہے، یہ کم اور زیادہ ہونا طبعی معاملہ ہے، اور انسان کے اختیار سے باہر ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر گرفت نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ کا خوف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ

چنانچہ حدیث شریف میں یہ واقعہ آیا ہے کہ ایک مرتبہ ازواج مطہرات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھی ہوئی تھیں، اور بے تکلفی کی باتیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کر رہی تھیں، اتنے میں یہ اطلاع ملی کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آ رہے ہیں، اس وقت تک پردے کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کے آنے کی اطلاع کا سن کر تمام ازواج مطہرات وہ بے تکلفانہ انداز ختم کر کے سب ادب سے بیٹھ گئیں، جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجلس میں آ گئے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ یہ عجیب معاملہ ہے کہ تمہارے آنے سے پہلے یہ

سب بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھیں، اور تمہارے آنے پر یہ ڈر گئیں، اور مؤدب ہو کر بیٹھ گئیں، اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ازواج مطہرات سے کہا کہ:

اَیْ عَدُوَّاتِ اَنْفُسِهِنَّ ،اَتَهَبْنَنِیْ وَلَا تَهَبْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

یعنی اے جانوں پر ظلم کرنے والیو! تم مجھ سے ڈرتی ہو، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ڈرتی ہو؟ ازواج مطہرات نے جواب دیا:

نَعَمْ ،اَنْتَ اَفَظُّ وَاَغْلَظُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

جی ہاں! اس لئے کہ آپ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں سخت کلام اور سخت مزاج والے ہیں۔ اب دیکھئے کہ ازواج مطہرات کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے طبعی خوف زیادہ تھا، اس لئے کہ یہ غیر اختیاری معاملہ ہے۔

شیطان کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ڈرنا

ایک حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس راستے سے عمر گزرتے ہیں، شیطان ڈر کے مارے اس راستے سے نہیں گزرتا۔ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے اس حدیث کے بارے میں سوال کیا کہ یہ کیا معاملہ ہے کہ جس راستے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ گزرتے ہیں، اس

راستے سے شیطان نہیں گزرتا، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ یہ معاملہ نہیں تھا، اور خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ نہیں آیا کہ جس راستے سے آپ گزریں اس راستے سے شیطان نہیں گزرتا، کیا شیطان حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ڈرتا ہے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نہیں ڈرتا ہے؟ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا معمول یہ تھا کہ پہلے ظرافت کا جواب دیا کرتے تھے، اور پھر تحقیقی جواب دیا کرتے تھے، اس لئے جب اس شخص نے یہ سوال کیا تو پہلے آپ نے اس شخص سے فرمایا: پوچھو اس بیوقوف سے وہ ایسا کیوں کرتا تھا؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کیوں نہیں ڈرتا، اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کیوں ڈرتا ہے؟

کسی سے زیادہ ڈر اس کی عظمت کی دلیل نہیں

پھر تحقیقی جواب دیا کہ دراصل یہ ڈر اور خوف طبعی کیفیت ہے، اور اس کے مختلف اسباب ہوتے ہیں، لہٰذا کسی شخص سے ڈر زیادہ ہونا اس کے اعظم ہونے کی دلیل نہیں کہ اس کی عظمت دل میں زیادہ ہے، یا اس کی محبت زیادہ ہے، بلکہ اس شخص کی ایک خاص طبیعت ہے، اس طبیعت کی وجہ سے آدمی کے دل میں رکاوٹ اور ڈر پیدا ہوتا ہے۔ ایک دوسرا آدمی ہے، جو پہلے والے شخص سے افضل اور اعظم ہے، لیکن اس کے دل میں نرمی ہے، جس کی وجہ سے لوگ اس سے بے تکلف ہو جاتے ہیں، اور اس سے اپنے دل کی بات کہنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے، اس وجہ سے اس سے ڈر محسوس نہیں ہوتا، لہٰذا کسی سے ڈر کا زیادہ

ہونا اس کے اعظم ہونے کی دلیل نہیں، اگر شیطان حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زیادہ ڈرتا ہے تو یہ ان کا طبعی معاملہ ہے، اور اس بات کی دلیل نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے افضل ہو گئے، اسی لئے اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ "مخلوق کا ڈر خالق کے ڈر سے طبعاً زیادہ ہونا مذموم نہیں کہ غیر اختیاری ہے"

عقلاً اللہ کا ڈر زیادہ ہونا چاہئے

آگے فرمایا کہ "اور عقلاً اور اعتقاداً زیادہ ہونا البتہ مذموم ہے" یعنی عقلاً اللہ کا ڈر مخلوق کے ڈر سے زیادہ ہونا چاہئے، طبعاً اللہ کا ڈر زیادہ ہونا کوئی ضروری نہیں، اب سوال یہ ہے کہ عقلاً اللہ کا ڈر زیادہ ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عقلاً اللہ کا ڈر زیادہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی دل میں یہ سوچے کہ مجھے مخلوق سے زیادہ تکلیف پہنچ سکتی ہے یا اللہ کے عذاب سے زیادہ تکلیف پہنچ سکتی ہے؟ جب ان دونوں میں موازنہ کرے گا تو اس وقت ظاہر ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے گا کہ اللہ کے عذاب سے زیادہ تکلیف ہوگی، لہٰذا عقلی طور پر اللہ کے عذاب سے بچنے کی فکر زیادہ کرنی چاہئے، جب یہ بات دل میں ہے تو بس انشاء اللہ مقصود حاصل ہے۔ اس کے بعد طبعی طور پر خوف کی جو کیفیت ہوتی ہے، مثلاً ڈر جانا، سہم جانا، دہل جانا، فکر طاری ہو جانا، دماغ پر خوف کا مسلط ہو جانا، یہ سب غیر اختیاری کیفیات ہیں، لہٰذا اگر یہ غیر اختیاری کیفیات

مخلوق سے زیادہ ہوگئیں ہیں تو اس میں گھبرانے کی بات نہیں۔ کیسی عجیب بات حضرت والا نے بیان فرمادی، اور کتنا بڑا خلجان دور کردیا، اس لئے کہ بعض اوقات جب آدمی یہ سوچتا ہے کہ میں خالق کے مقابلے میں مخلوق سے زیادہ ڈرتا ہوں، تو دماغ میں یہ خیال آئے گا کہ میرا تو ایمان ہی جاتا رہا، حضرت والا نے اس خلجان اور خیال کو دور فرمادیا۔

مخلوق محسوس ہیں، اللہ محسوس نہیں

پھر آگے عجیب بات ارشاد فرمائی کہ قرآن کریم کی آیۃ "لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِنَ اللّٰهِ" کا بھی یہی محمل ہے، یعنی مخلوق کا ڈر خالق کے ڈر سے زیادہ ہونا اعتقاداً مذموم ہے، طبعاً مذموم نہیں، اور طبعاً مذموم نہ ہونے کی تین وجوہ ہیں، پہلی وجہ یہ ہے کہ مخلوق محسوس ہے، اللہ تعالیٰ محسوس نہیں، یعنی مخلوق نظر آرہی ہے، مثلاً ایک شخص پستول تانے کھڑا ہے تو وہ شخص بھی نظر آرہا ہے، اور پستول بھی نظر آرہا ہے، اور یہ بھی نظر آرہا ہے کہ اگر پستول سے گولی چل گئی تو میں مرجاؤں گا۔ جبکہ اللہ جل شانہ بذات خود محسوس نہیں، اللہ تعالیٰ کو نہ آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے، نہ ہاتھوں سے چھوا جاسکتا ہے، اور نہ جہنم کا عذاب نظر آرہا ہے، اور انسان کی طبیعت ایسی ہے کہ اس چیز کا اثر زیادہ لیتا ہے جو چیز محسوس ہورہی ہو، بنسبت اس چیز کے اثر کے جو محسوس نہ ہو، اگرچہ عقلاً اس کے وجود کو مانتا ہے، لیکن طبیعت پر اس کا اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا محسوس چیز کا ہوتا ہے۔

غائب کے مقابلے میں حاضر سے ڈر زیادہ ہوتا ہے

یا مثلاً کسی شخص کو اس بات کا خطرہ لگا ہوا ہے کہ کل کو یہ واقعہ پیش آجائے گا، لیکن ایک واقعہ ابھی آنکھوں کے سامنے پیش آرہا ہے، تو اس واقعہ کا ڈر، خوف اور اس سے بچنے کی فکر اور اس کی گھبراہٹ زیادہ ہوگی، بنسبت اس واقعہ کے خوف کے جو کل آنے والا ہے، اس لئے جو وقعہ ابھی پیش آرہا ہے، وہ محسوس ہورہا ہے، اور جو واقعہ کل پیش آئے گا وہ محسوس نہیں ہے۔ یہ انسان کی طبعی بات ہے۔ اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر مؤاخذہ بھی نہیں ہوگا کہ تمہارے اندر مخلوق کے خوف کی زیادتی کیوں ہے؟ اس لئے کہ "طبعاً حاضر کا اثر زیادہ ہوتا ہے غائب سے" جو شخص سامنے بیٹھا ہے اس کا جو اثر ہوگا وہ غائب کا نہیں ہوگا، چاہے غائب کی عظمت دل میں زیادہ ہو۔

مخلوق سے معافی کی امید کم ہے

دوسری وجہ یہ ہے کہ "مخلوق سے تسامح کی توقع کم ہے اور خالق سے زیادہ ہے" یہ بہت بڑی بات بیان فرمادی، اس لئے کہ مخلوق بڑی خراب چیز ہے، یہ کسی کو نہیں بخشتی، اگر مخلوق کے سامنے یہ بات آجائے کہ فلاں نے یہ گناہ کیا ہے، تو یہ مخلوق اس کو نہیں بخشے گی، بلکہ اس کو بدنام اور رسوا کرے گی، اس کو سزا دلوائے گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا معاملہ ایسا ہے کہ بندہ گناہ بھی کررہا ہے، لیکن ساتھ میں شرمندہ بھی ہے، اور یہ سوچتا ہے کہ میرا معاملہ میرے اللہ سے ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ شاید مجھے معاف فرمادیں۔ تو وہاں معافی کی توقع زیادہ ہے، بنسبت مخلوق

کے، اس لئے بندوں کے سامنے گناہ ظاہر ہونے کے خیال سے انسان پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

جہنم میں جانا گوارا کر لے گا

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ذرا تصور کرو کہ تم اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوئے، اور تم نے درخواست کی کہ یا اللہ! مجھ سے جو گناہ سرزد ہوئے ہیں، اپنی رحمت سے مجھے معاف فرما۔ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ ہم تمہارے گناہ معاف تو کر دیں گے، اور تمہیں جہنم کا عذاب نہیں دیں گے، لیکن ایک شرط ہے، وہ شرط یہ ہے کہ تمہارے اعمال نامہ کی ایک فلم لوگوں کے سامنے چلائیں گے، اور اس فلم کو دیکھنے والوں میں تمہارا باپ ہوگا، تمہاری ماں ہوگی، تمہارے بہن بھائی ہوں گے، تمہارے بیوی بچے ہوں گے، تمہارے دوست احباب ہوں گے، تمہارے شاگرد ہوں گے، تمہارے مرید بھی ہوں گے، اور فلم چلانے کے بعد ہم تمہیں معاف فرما دیں گے، اور تمہیں جنت میں بھیج دیں گے، اگر اللہ تعالیٰ معاف کرنے پر یہ شرط لگا دیں تو کوئی آدمی ایسا بھی ہوگا جو کہے گا کہ یا اللہ! آپ مجھے تھوڑی دیر کے لئے جہنم میں بھیج دیں، یہ بہتر ہے اس سے کہ آپ ان لوگوں کے سامنے میری فلم چلائیں، اس لئے کہ مخلوق کے سامنے رسوائی سے زیادہ خوف ہوتا ہے، اور یہ خوف اس لئے ہوتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ مخلوق بڑی سنگ دل ہے، اگر اس کے علم میں میری کوئی کمزوری آ گئی تو یہ مجھے نہیں بخشے گی، اور اللہ جل جلالہ میرے خالق و

مالک ہیں، اصل عظمت انہی کو حاصل ہے، لیکن ان کے بارے میں مجھے یہ امید ہے کہ وہ مجھے معاف فرمادیں گے، ان سے کیا چھپانا، جو کچھ ہے ان کے سامنے ہے۔

مخلوق کی نظر میں ذلت ناگوار ہے

تیسری وجہ یہ ہے کہ مخلوق کی نظر میں ذلت ناگوار ہے، اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں ذلیل ہونا گوارا ہے، اس لئے کہ مخلوق کے سامنے کوئی گناہ آ گیا تو ذلت ہوگی، وہ مخلوق یہ کہے گی کہ یہ بڑا بدعمل آدمی ہے، بڑا فاسق و فاجر آدمی ہے، بڑا گناہ گار، بڑا مکار ہے، بڑا منافق ہے، اور مخلوق کی نظر میں ذلت بڑی ناگوار بات ہے۔ دوسری طرف اگر اللہ جل شانہ کی نظر میں یہ بات آجائے کہ بندہ بڑا فاسق و فاجر ہے، یہ بڑا گناہ گار اور خطا کار ہے، تو یہ بھی ذلت ہے، لیکن یہ ذلت مطلوب ہے، اس لئے بندہ خود ہی اللہ تعالیٰ کے سامنے اقرار کرتا ہے کہ یا اللہ! میں بڑا گناہ گار ہوں، بڑا خطا کار ہوں، مجھ سے بڑی غلطی ہوگئی، اقراری مجرم ہوں، مجھے معاف فرمایں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے سامنے ذلیل ہونا مطلوب ہے، اور مخلوق کے سامنے ذلیل ہونا ناگوار ہے، اور شرعاً بھی ذلت مطلوب نہیں، چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا مانگی:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْرًا وَ فِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْرًا

اے اللہ! مجھے اپنی نگاہ میں تو چھوٹا بنا، اور لوگوں کی نگاہ میں بڑا بنا۔ اس لئے کہ لوگوں کی نگاہ میں عزت مطلوب ہے، ذلت مطلوب نہیں، البتہ اللہ تعالیٰ

کے سامنے ذلت عین مطلوب ہے، اسی لئے حضرت والا نے فرمایا کہ مخلوق کا ڈر زیادہ ہوتا ہے خالق کے ڈر کے مقابلے میں، اور یہ ایمان کی کمزوری کی علامت نہیں، اور نہ گھبرانے کی بات ہے۔

شیخ کامل ہی صحیح علاج بتا سکتا ہے

یہ باتیں شیخ کامل ہی بتا سکتا ہے، ورنہ اگر کسی معمولی آدمی کے سامنے یہ بات کہی جائے کہ مجھے مخلوق سے زیادہ ڈر لگتا ہے خالق کے مقابلے میں، تو وہ جواب میں یہ کہے گا کہ تو کافر ہو گیا، یہاں سے بھاگ جا، تو اللہ سے نہیں ڈرتا؟ اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ (الاحزاب:۳۷) لیکن جو شخص نفس کی باریکیوں سے واقف ہے، اور جو یہ جانتا ہے کہ یہ انسان ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی طبیعت کے اندر کیا کیا باتیں رکھی ہیں، اور حقیقت حال کیا ہے؟ اس نے چند لفظوں میں یہ سارا مسئلہ حل کر دیا، اور سارا شک وشبہ دور کر دیا۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے، یہ ایک ایسا مقام ہے کہ اگر اس میں ذرا بھی رہنمائی غلط ہو جائے تو آدمی کفر اور نفاق تک پہنچ جاتا ہے، مایوسی تک پہنچ جاتا ہے، اس کے اوپر یاس طاری ہو جاتی ہے، اور شیطان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ لیکن شیخ کامل نے کانٹا بدل دیا کہ سارے شکوک وشبہات کافور ہو گئے، اور جو حقیقت حال ہے وہ بیان کر دی۔

علاج کا ایک طریقہ "تصور شیخ"

اسی وجہ سے ہمارے بزرگوں نے علاج کا جو ایک طریقہ تجویز فرمایا ہے،

اس میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو لوگوں کے لئے غلط فہمی کی وجہ سے اعتراض کا سبب بن گئیں، چنانچہ "تصور شیخ" کا لفظ آپ نے سنا ہوگا، یہ علاج کا ایک طریقہ تھا، جو مشائخ اپنے مریدین سے بطور علاج کرایا کرتے تھے، اور مشائخ اپنے مریدین سے کہتے کہ جس وقت تم ذکر کرو تو ذکر کے وقت اپنے شیخ کا تصور کرو، اگر کسی گناہ کا تقاضہ دل میں پیدا ہو رہا ہے تو اس وقت بھی اپنے شیخ کا تصور کرو۔ اس پر لوگوں نے اعتراض کیا کہ یہ ذکر کے وقت تصور شیخ تو "شرک" ہے، اس لئے کہ ذکر تو اللہ کے لئے کیا جاتا ہے، لہٰذا تصور بھی اللہ کا کرنا چاہئے، نہ کہ شیخ کا تصور۔

حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور تصور شیخ

یہاں تک نوبت آئی کہ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ حضرت شاہ سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مرید شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کو یہ تجویز کیا کہ آپ "تصور شیخ" کیا کریں، جواب میں حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت! اگر آپ مجھے کسی گناہ کے کرنے کا حکم دیتے تو میں اس خیال سے وہ گناہ کر لیتا کہ بعد میں توبہ کرلوں گا، لیکن اس عمل میں مجھے شرک کی بو آتی ہے، اس لئے یہ کام میں نہیں کرسکتا۔ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ چلو تم اس سے مستثنیٰ ہو۔ اب دیکھئے! ان کو اس کے اندر شرک کی بو آئی، حالانکہ حقیقت میں اس کے اندر کوئی شرک نہیں ہے، لیکن چونکہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر توحید کا غلبہ تھا، اور اللہ تعالیٰ نے توحید پر استقامت عطا فرمائی تھی، اس وجہ سے انہوں نے یہ کہا۔

"تصور شیخ" کا مقصد یکسوئی حاصل کرنا

لیکن بعض لوگوں نے "تصور شیخ" پر اعتراض کرتے ہوئے باقاعدہ یہ کہہ دیا کہ یہ شرک ہے، اور جو لوگ "تصوف" پر اعتراض کرنے والے ہیں، وہ "تصور شیخ" ہی کی بنیاد پر یہ کہتے ہیں کہ یہ "تصوف" شرک کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ "تصور شیخ" کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ دماغ کو ذکر اللہ کے وقت یکسو کیا جائے، اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا خیال دل و دماغ میں اس لئے نہیں جمتا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات "محسوس" نہیں، کسی محسوس چیز کا تصور انسان کرے گا تو وہ تصور جم جائے گا، غیر محسوس چیز کا تصور نہیں جمے گا، مبتدی شخص جس کے دل و دماغ پر اللہ کا ذکر اور فکر چھایا نہیں ہے، اس کے لئے صوفیاء نے ایک محسوس تجویز کردی کہ اپنے شیخ کا تصور کیا کرو، اور پھر جو حضرات اس تصور کو تجویز کرتے تھے، وہ صرف اس حد پر اکتفاء نہیں کرتے تھے، بلکہ تصور شیخ کے ذریعہ جب ایک مرتبہ یکسوئی حاصل ہوگئی تو بعد میں اس یکسوئی کا رُخ اللہ تعالیٰ کی جانب پھیر دیتے تھے، اور پھر وہ ذاکر اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہو جاتا تھا۔

"تصور بھینس" سے علاج

جیسے میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ ایک بزرگ کے پاس ایک دیہاتی اپنی اصلاح کرانے اور مرید ہونے کے لئے گیا، اس نے جاکر کہا کہ حضرت! مجھے مرید کرلو، ان بزرگ نے اس کو مرید کرلیا، اس کے بعد اس نے کہا کہ میں کیا کروں، میرا نہ ذکر میں دل لگتا ہے، نہ نماز میں دل لگتا ہے، میں

تو بس نماز میں اٹھک بیٹھک کرتا رہتا ہوں۔ ان بزرگ نے اس سے پوچھا کہ ساری دنیا میں تجھے کس چیز سے زیادہ محبت ہے؟ اس دیہاتی نے جواب دیا کہ میری ایک بھینس ہے، مجھے اس سے بہت زیادہ محبت ہے، ان بزرگ نے اس سے کہا کہ تو روزانہ رات کو اپنے کمرے میں بیٹھ کر ایک گھنٹہ تک بھینس کا تصور کیا کر۔ اس دیہاتی نے کہا کہ میں تو اللہ میاں کی طرف متوجہ ہونا چاہتا ہوں۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ میں جو کہہ رہا ہوں تو وہ کر، چنانچہ وہ کمرے میں بیٹھ گیا، اور بھینس کا تصور کرنے لگا، چنانچہ چند دنوں کے بعد اس کے دل و دماغ پر بھینس مسلط ہوگئی کہ بھینس آرہی ہے، بھینس جارہی ہے، بھینس دودھ دے رہی ہے، بھینس چر رہی ہے، بھینس نہارہی ہے، یہاں تک نوبت آگئی کہ جب شیخ اس کے کمرے میں داخل ہوئے تو اپنے شیخ سے کہنے لگا کہ نہیں، ابھی یہاں نہ آنا، یہاں بھینس آرہی ہے، جب اس حد تک بھینس اس کے دل و دماغ پر مسلط ہوگئی تو شیخ نے کہا کہ بس، اب کام بن گیا، چنانچہ بھینس کے تصور کے رخ کو اللہ کے تصور کی طرف پلٹ دیا۔ یہ سب اس لئے کیا کہ ابتداءً اللہ جل شانہ کی طرف دھیان لے جانا اس کے لئے ممکن نہیں تھا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ محسوس نہیں ہیں، اس لئے پہلے اس کے ذہن کو تمام خیالات سے فارغ کرکے یکسو کردیا، تو اب اس کا رخ موڑنا آسان ہوگیا۔

یکسوئی کے بعد رخ موڑ دو

یہ "تصورِ شیخ" بھی اسی لئے کرایا جاتا ہے کہ تمام خیالات سے فارغ

کر کے ذہن کو یکسو کر دیا جائے، پھر اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف موڑ دیا جائے، لیکن اعتراض کرنے والوں نے یہ کہہ دیا کہ یہ "بھینس" کا تصور بھی شرک ہے، اور "شیخ" کا تصور بھی شرک ہے، حالانکہ یہ ذہن کو فارغ کرنے اور اس کو یکسو کرنے کا ایک علاج تھا، اور جب ذہن یکسو ہو گیا تو اس کا رخ موڑ دیا، اس کے اندر یہ بات نہیں ہے کہ مخلوق کو خالق کے برابر ٹھہرا دیا، بلکہ یہ ایک علاج ہے۔

بدنظری کا ایک علاج

چنانچہ ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کبھی دل میں بدنظری کا داعیہ پیدا ہو تو اس وقت یہ تصور کر لیا کرو کہ اگر اس وقت میرے استاذ میرے سامنے آجائیں، یا میرے والد آجائیں، یا میری اولاد آجائے، اور وہ مجھے اس حالت میں دیکھ لیں کہ میں غیر محرم کو دیکھ کر لذت لے رہا ہوں، تو اس وقت وہ لوگ میرے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ جب تم یہ سوچ گے تو انشاء اللہ اس گناہ کرنے کا داعیہ کمزور ہو جائے گا۔

اللہ کے دیکھنے کا تصور کیوں نہ کرے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت نے یہ تو فرمایا کہ اس گناہ کے وقت یہ سوچے کہ میرا استاذ دیکھ رہا ہے، میرا باپ دیکھ رہا ہے۔ یہ کیوں نہیں فرمایا کہ وہ یہ سوچے کہ میرا اللہ مجھے دیکھ رہا ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ علم تو ہمیں حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت ہمیں دیکھ رہے ہیں، لیکن چونکہ اللہ جل شانہ کی ذات محسوس نہیں، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کا تصور قائم کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔ اس

لئے مبتدی کے لئے آسانی اس میں ہے کہ وہ کسی ایسی شخصیت کا تصور کرلے جو محسوس ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ استاذ اور باپ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں زیادہ عظمت والے ہیں، اور ان حضرات کی ناراضگی اللہ کی ناراضگی کے مقابلے میں زیادہ خطرناک ہے، یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ اس لئے کہ ان کے علم میں آنے سے زیادہ بدنامی اور زیادہ رسوائی ہے، اور یہ لوگ اس طرح سے معاف نہیں کر سکتے جس طرح سے اللہ تعالیٰ معاف کر سکتے ہیں۔

حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کے درمیان مکالمہ

ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھانا کھا رہے تھے، اتنے میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے پاس پہنچ گئے، یہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دوست بھی تھے، اور ان دونوں کے رمیان لطیفے بھی ہوا کرتے تھے، جب وہاں پہنچے تو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

اُدْنُ فَکُلْ۔ آؤ کھانا کھالو،

انہوں نے جواب دیا:

قَدْ اَکَلْتُ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ اے امیر المؤمنین! میں کھانا کھا چکا ہوں،

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

اِنَّ مِنْ شَحَاحَةِ الْمَرْءِ اَنْ لَّا یَدَعَ الْمَرْءُ فِیْ بَطْنِهٖ مُسْتَزَادًا لِلْمُسْتَزِیْدِ۔

یہ بلیغ جملہ کہا کہ یہ بڑی طمع اور حرص کی بات ہے کہ آدمی
جب کھانا کھائے تو اتنی گنجائش بھی نہ چھوڑے کہ دوسرا
آدمی کھانا کھلانا چاہے تو اس کی فرمائش بھی قبول نہ کرے۔
اس طرح کھانا تو بری بات ہے۔

انہوں نے جواب دیا: چونکہ وہ حاضر جواب تو تھے،

قَدْ فَعَلْتُ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ!

امیر المؤمنین، میں نے ایسا ہی کیا ہے، یعنی میں نے یہ
نہیں کیا کہ پورا پیٹ بھر لیا ہو، اور جگہ نہ چھوڑی ہو، بلکہ
پیٹ میں جگہ چھوڑی ہے،

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا:

اَلِمَنْ هُوَ اَوْجَبُ حَقًّا مِنْ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ

یعنی یہ جو تم نے جگہ چھوڑی ہے کسی ایسے شخص کے لئے
چھوڑی ہے جس کی فرمائش پوری کرنا امیر المؤمنین کے
مقابلے میں زیادہ ضروری ہو؟ یعنی جب میں نے تمہیں
کھانے کے لئے بلایا تو تم نے انکار کر دیا، اب یہ جو جگہ تم
نے چھوڑی ہے وہ کس کے لئے چھوڑی ہے؟ اس طرح
حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو پھانس دیا۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا:

لَا، وَلٰكِنْ لِمَنْ لَا يَعْذُرُ عُذْرَ اَمِيْرِالْمُؤْمِنِيْنَ

یعنی میں نے یہ جگہ اس شخص کے لئے چھوڑی ہے جو امیر المؤمنین کی طرح معذرت قبول نہ کرے، اور معاف نہ کرے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ تو معاف کر دیں گے، اور معذرت قبول کرلیں گے، لیکن بعض لوگ ایسے ضدی ہوتے ہیں جو معذرت قبول نہیں کرتے، ان کی وجہ سے یہ جگہ چھوڑی ہے، آپ کی وجہ سے نہیں چھوڑی ہے۔

خلاصہ

بہر حال! آدمی بعض اوقات کسی دوسرے سے اس وجہ سے ڈرتا ہے کہ اگر اس کو پتہ چل گیا تو یہ مجھے نہیں چھوڑے گا، معاف نہیں کرے گا، لیکن دوسرا شخص جو پہلے کے مقابلے میں کتنے ہی بڑے درجے کا کیوں نہ ہو، اس سے اس لئے نہیں ڈرتا کہ اگر اس کو پتہ لگ گیا تو اس سے معافی مانگ لوں گا، اس کے آگے ہاتھ پاؤں جوڑلوں گا، تو وہ مجھے معاف کر دے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے والے شخص کی عظمت زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمارے دلوں میں اپنا خوف اور اپنی رجا دونوں پیدا فرمادے، اور دونوں میں اعتدال بھی عطا فرمادے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العٰلمین

اعمال کے دنیاوی اثرات

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

اعمال کے دنیاوی ثمرات

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین، والعاقبة للمتقین،
والصلوٰة والسّلام علی رسوله الکریم وعلی آله
اصحابه اجمعین۔ امابعد!

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ:

''اعمال صالحہ میں نفع نقد بھی ہے، صرف اُدھار ہی نہیں۔ ہاں! ایک اُدھار بھی ہے، یعنی ثواب، اور اس کے ساتھ ایک چیز نقد بھی ہے، یعنی رجا اور امید، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا وابستہ ہو جانا، جو بدون اعمال صالحہ کے حاصل نہیں ہوتا، اسی طرح اعمال سیئہ کا ایک ثمرہ ادھار ہے، اور ایک نقد ہے، ادھار تو عذاب جہنم ہے، اور نقد وہ وحشت، ظلمت اور بے چینی ہے، جو گناہوں کو لازم ہے'' (انفاس عیسیٰ: ۲۰۵)

اعمال کا ثمرہ نقد بھی، اُدھار بھی

اس ارشاد کا مقصود ایک غلط فہمی کا ازالہ ہے، وہ یہ کہ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو کچھ اعمال اس دنیا میں کرتے ہیں، چاہے وہ نیک اعمال ہوں یا برے اعمال ہوں، ان کا نتیجہ اور ثمرہ، اور ان کا فائدہ اور نقصان آخرت میں ظاہر ہوگا۔ اگر اعمال اچھے ہیں تو ثواب ملے گا ان شاء اللہ، اگر اعمال خراب ہیں تو عذاب ہوگا۔ گویا کہ جو کچھ بھی ہے وہ ادھار ہے، یہاں دنیا

میں نقد کچھ نہیں، حضرت والا اس ملفوظ میں اس غلط فہمی کی تردید فرمارہے ہیں کہ یہ بات نہیں ہے کہ اعمال کے تمام ثمرات اور ان کے تمام نفع نقصان ادھار ہی ہوں، بلکہ اعمال کے کچھ ثمرات انسان کو اس دنیا میں بھی مل جاتے ہیں۔

نیک عمل کا پہلا نقد فائدہ

وہ نقد ثمرات کیا ہیں؟ اس پر فرمایا کہ نیک اعمال کا سب سے پہلا ثمرہ یہ ملتا ہے کہ نیک عمل کرنے کے بعد انسان کو یہ امید ہو جاتی ہے کہ شاید اللہ تبارک وتعالیٰ اس عمل کی بدولت اپنے فضل وکرم سے اس عمل کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرما کر مجھے نواز دیں، اس کا نام ''رجا'' اور ''امید'' ہے، یہ نیک عمل کا نقد فائدہ ہے، جو انسان کو حاصل ہوتا ہے۔

اپنے عمل پر نظر خود پسندی ہے

یہاں ایک باریک بات کا سمجھنا ضروری ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو نیک عمل کرنے کی توفیق دی ہے، اگر انسان کی نگاہ اس عمل کی طرف ہو جائے، اور وہ یہ سوچے کہ مجھ سے یہ بڑا اچھا کام ہو گیا، اور اس کے نتیجے میں آدمی عجب کے اندر مبتلا ہو جائے، یا یہ سمجھے کہ بس یہ میرا نیک عمل مجھے نجات دلائے گا، اور مجھے جنت میں لے جائے گا تو یہ بڑی خطرناک بات ہے، اور اسی کو صوفیاء کرام کی اصطلاح میں ''رؤیت عمل'' اور ''خود پسندی'' کہا جاتا ہے، مثلاً ایک شخص نماز پڑھے، اور یہ سوچے کہ میں بڑی اچھی نماز پڑھتا ہوں، اور چونکہ میں اچھی نماز پڑھتا ہوں، اس لئے میں بڑا اچھا ہوں، یا یہ سوچے کہ میری یہ نماز مجھے جنت میں لے جائے گی، یہ سوچ بڑی خطرناک ہے۔ اب ایک طرف تو حضرت والا یہ فرمارہے ہیں کہ عمل کا نقد ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ اس نیک عمل سے امید پیدا ہو جاتی ہے، اور دوسری طرف صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ ''رؤیت عمل'' اور ''خود پسندی'' ناجائز ہے، بقول کسی کے:

هزار نکته باریك تر زمو ایں جاست

نه هر که سر بتراشد قلندری داند

یہ بہت خطرناک وادیاں اور گھاٹیاں ہیں، جن سے انسان کو گزرنا پڑتا ہے۔

خود پسندی اور رجا میں فرق

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان فرق کس طرح کیا جائے؟ آیا کہ یہ سوچ ''خود پسندی'' میں داخل ہے یا یہ ''رجا'' اور ''امید'' میں داخل ہے؟ دونوں کے درمیان فرق اس طرح ہے کہ اگر کسی عمل کے کرنے کے بعد طبیعت میں بشاشت اور خوشی پیدا ہوئی، اور اس بشاشت کے نتیجے میں شکر ادا کیا کہ الحمد للہ مجھے اس نیک عمل کی توفیق ہوگئی، اور یہ امید بندھ گئی کہ جب اللہ تعالیٰ نے مجھے اس عمل کی توفیق دی ہے کہ اس بات کی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مجھے نواز دیں گے، بس اس حد تک تو یہ ''رجا'' ہے، چنانچہ ایک حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَائَتْكَ سَيِّئَتُكَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ

جب تمہیں اپنے اچھے عمل سے خوشی ہو، اور برے کام سے رنج اور تکلیف ہو، تو یہ تمہارے ایمان کی علامت ہے۔ ایک صحابی نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ یا رسول اللہ! بعض اوقات میں کوئی اچھا عمل کرتا ہوں، تو عمل کرنے کے بعد مجھے خوشی ہوتی ہے کہ الحمد للہ میں نے ایک اچھا عمل کیا، کیا یہ خوشی ''عجب'' اور ''تکبر'' تو نہیں ہے؟ جواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ

یعنی نیک عمل کر کے تمہیں جو خوشی حاصل ہوئی، یہ مؤمن کے لئے نقد خوشخبری ہے، لہٰذا گھبرانے کی بات نہیں۔

جنت فضل پر ملے گی، عمل پر نہیں

صوفیاء کرام جس کو ''رؤیت عمل'' اور خود پسندی'' کہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ آدمی کو نیک عمل کرنے کے بعد اپنے عمل پر یہ گھمنڈ ہو جائے کہ یہ میرا عمل اتنا اچھا ہے کہ یہ مجھے سیدھا جنت میں لے جائے گا۔ اور میرا جنت میں جانا اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی بنیاد پر نہیں، بلکہ میرے عمل کی ذاتی خاصیت کی بنیاد پر میں اس بات کا مستحق ہو چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں داخل کر دیں۔ یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ ارے استحقاق کوئی چیز نہیں، تم کتنا ہی عمل کرتے رہو، مگر جنت کا استحقاق پیدا نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ جنت کی نعمتیں غیر متناہی ہیں، اس کے آگے تمہارے عمل کی کیا حقیقت ہے؟ تم نے تو دو منٹ میں ایک عمل کر لیا، یا پانچ منٹ میں ایک عمل انجام دیدیا، اور پھر کہنے لگے کہ مجھے اس عمل کے بدلے جنت چاہیئے، وہ جنت جو غیر متناہی ہے، اور جس کی نعمتیں ابدی ہیں، جن کی کوئی حد و نہایت نہیں، چار رکعات کے بدلے ایسی جنت مانگتے ہو؟ تم کتنا ہی عمل کرتے رہو پھر بھی جنت کا استحقاق نہیں ہوگا، فرض کرو کہ تم کو اسی سال کی زندگی ملی، اور تم نے اپنی پوری زندگی سجدے میں پڑے پڑے گزار دی، تو اس کا مطلب یہ ہوا تم سے زیادہ نے زیادہ اسی سال عبادت کی، اور دوسری طرف جنت کی نعمتیں، نہ سو سال، نہ ہزار سال، نہ لاکھ سال، بلکہ دائمی اور ابدی ہیں، اگر انسان ساری عمر بھی عبادت کرتا رہے تو جنت کا استحقاق پیدا نہیں ہوگا، لہٰذا انسان کا کوئی عمل ایسا نہیں جو انسان کو جنت کا مستحق بنا دے، یہ ان کا کرم ہے کہ بعض مرتبہ وہ کہہ دیتے ہیں کہ اے بندے! تو نے چونکہ یہ عمل کیا تھا، اس لئے ہم تمہیں جنت کا مستحق بنا دیتے ہیں۔ قرآن کریم کی بعض آیات میں استحقاق کی طرف اشارہ بھی فرمایا، مگر وہ استحقاق بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے پیدا کیا ہوا ہے، ورنہ عمل کے اندر اپنی ذات میں یہ طاقت نہیں کہ

وہ جنت کا مستحق بناتا، ساری زندگی روزے میں گزار دو، ساری زندگی عبادت میں ذکر و تسبیح میں گزار دو، تب بھی استحقاق پیدا نہیں ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اور جنت

اسی لئے حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی انسان کا کوئی عمل اس کو جنت میں نہیں لے جائے گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سوال کیا کہ آپ کا بھی عمل آپ کو جنت میں نہیں لے جائے گا؟ آپ نے جواب میں فرمایا:

لَا، اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰہُ بِرَحْمَتِہٖ

نہیں، میرا عمل بھی مجھے جنت میں نہیں لے جائے گا، جب تک کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ نہ لیں۔ آپ دیکھیں کہ ساری کائنات میں کسی کا بھی عمل کتنا اور کیفا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے برابر تو کجا اس کا پاسن بھی نہیں ہوسکتا، آپ یہ فرما رہے ہیں کہ میرا عمل بھی مجھے جنت میں نہیں لے جائے گا، جب تک اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت میں ڈھانپ نہ لے، اس سے پتہ چلا کہ عمل سے جنت کا استحقاق پیدا نہیں ہوتا۔

نیک اعمال فضل کی علامت ہیں

البتہ اللہ تعالیٰ نے ان نیک اعمال کو اپنے فضل و کرم کی علامت بنایا ہے، یعنی اگر کوئی شخص یہ اعمال کر رہا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ انشاء اللہ، اللہ کا فضل اس شخص پر ہوگا، اور اس نیک عمل کے انجام پانے پر خوشی اس بات کی ہے کہ جب مجھے اللہ تعالیٰ نے نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی تو الحمد للہ میرے اندر وہ علامت پائی گئی جس سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مجھے نواز دیں گے۔ لہٰذا یہ مسرت، علامت پائے جانے کی مسرت ہے، یہ اس بات کی مسرت نہیں کہ مجھ سے کوئی بہت بڑا کام انجام پا گیا ہے، جو مجھے

جنت کا مستحق بنا دے گا۔ یہ باریک بات ہے، جو ذہن میں رہنی چاہئے۔

عمل سے جنت کا مستحق نہیں ہوتا

اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب کوئی بندہ نیک عمل کرتا ہے تو اس کو نواز دیتے ہیں، اور اس کو اپنے فضل و کرم کا مورد بنا دیتے ہیں، اور بغیر عمل کے عادۃً فضل و کرم کا مورد نہیں بناتے، اب اگر کوئی شخص یہ سوچے کہ جب میرا عمل مجھے جنت میں نہیں لے جائے گا تو پھر عمل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لئے کہ عمل سے جنت کا استحقاق تو پیدا ہوتا نہیں ہے، بس اللہ تعالیٰ سے بیٹھ کر مانگتے رہو کہ یا اللہ! مجھے اپنی رحمت کا مورد بنا دیجئے۔ یاد رکھیں کہ اللہ کی رحمت کا مورد بننے کے لئے اور جنت کا مستحق بننے کے لئے اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب کوئی شخص عمل کرے گا تو اس کو نوازا جائے گا، لہٰذا عمل ضروری بھی ہے، اور جنت میں جانے کے لئے علت تامہ بھی نہیں، اور جنت کے استحقاق کے لئے بھی علت تامہ نہیں، بلکہ یہ عمل اللہ تعالیٰ کے فضل کی ایک علامت ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ کا حکیمانہ ارشاد

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی حکیمانہ بات ارشاد فرمائی، فرمایا کہ جو شخص عمل کرتا ہے اور اس عمل کی بنیاد پر جنت کی آس لگائے بیٹھا ہے کہ اس کا یہ عمل اس کو جنت میں لے جائے گا تو وہ شخص خواہ مخواہ فضول محنت کر رہا ہے، اور جو شخص یہ آرزو کر رہا ہے کہ میں عمل کے بغیر جنت میں چلا جاؤں گا تو وہ شخص اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہے، اس لئے کہ دونوں باتیں غلط ہیں، کیونکہ کوئی بھی شخص عمل کے بغیر جنت میں نہیں جائے گا، اور تنہا عمل بھی اس کو جنت میں نہیں لے جائے گا، جب تک اس عمل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور اس کی رحمت شامل نہ ہو۔ لہٰذا عمل بھی کرنا ہے اور اس عمل کو علامت نجات بھی سمجھنا ہے،

لیکن اس عمل کو جنت کے استحقاق کا سبب نہیں سمجھنا ہے، لہٰذا جب اللہ جل شانہ کی طرف سے نیک عمل کی توفیق ہو تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اور کہو کہ اے اللہ! آپ کا فضل و کرم ہے کہ آپ نے مجھے اس عمل کی توفیق عطا فرمادی۔ اور یہ امید رکھو کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس نیک عمل کی توفیق عطا فرمائی ہے تو اس نے ہمیں نوازنے کا ارادہ فرمایا ہے، اگر نوازنا نہ ہوتا تو نیک عمل کی توفیق نہ دیتے۔

نیک عمل کی توفیق ان کی طرف سے جواب ہے

حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات آدمی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ میں اللہ میاں کو اتنا پکارتا ہوں لیکن ان کی طرف سے کبھی جواب ہی نہیں آتا، کبھی تو جواب آتا، ہم دعا کر رہے ہیں تو انہیں پکار رہے ہیں، کبھی ذکر کے ذریعہ انہیں پکار رہے ہیں، کبھی نماز کے ذریعہ، کبھی تلاوت کے ذریعہ انہیں پکار رہے ہیں، لیکن کبھی جواب ہی نہیں آتا، یک طرفہ کاروبار ہو رہا ہے، یہ احمقانہ خیال بعض اوقات دل میں پیدا ہوجاتا ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس خیال کا جواب دے رہے ہیں کہ:

گفت اے اللہ تو لبیک ما است

یعنی تجھے ہمارا نام لینے کی جو توفیق ہو رہی ہے، یہی ہماری طرف سے جواب ہے، جب تم نے ایک مرتبہ ہمارا ذکر کیا، اس کے بعد دوبارہ تمہیں ہمارا نام لینے کی توفیق ہوگئی تو یہ خود ہماری طرف سے جواب اور لبیک ہے، اگر یہ جواب نہ ہوتا تو پھر دوبارہ تمہیں ہماری بارگاہ میں آنے کی توفیق ہی نہ ہوتی، تیرا ''اللہ'' کہنا ہی ہماری طرف سے ''لبیک'' ہے، اور تمہارے پہلے ذکر کی قبولیت کی علامت ہے۔

ایک نیک عمل کے بعد دوسرے نیک عمل کی توفیق

اسی لئے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب ایک نیک

عمل کے بعد دوبارہ اسی نیک عمل کی توفیق ہو جائے تو سمجھ لو کہ پہلا عمل قبول ہو گیا، اگر پہلا عمل قبول نہ ہوتا دوسری بار عمل کی توفیق نہ ملتی۔ مثلاً ظہر کی نماز آپ نے پڑھی، اور پھر عصر کی نماز پڑھنے کی توفیق ہو گئی تو سمجھ لو کہ ظہر کی نماز قبول ہو گئی، اگر ظہر کی نماز قبول نہ ہوتی تو عصر کی نماز پڑھنے کی توفیق نہ ملتی۔ گذشتہ کل آپ نے روزہ رکھا تھا، آج پھر رکھ لیا تو سمجھ لو کہ گذشتہ کل کا روزہ قبول ہو گیا، اگر وہ روزہ قبول نہ ہوتا تو دوبارہ روزہ رکھنے کی توفیق نہ ملتی۔ بہر حال! انسان عمل کرتا رہے، عمل کرنا نہ چھوڑے، اور عمل کر کے اس بات پر خوش ہو کہ اللہ تعالیٰ نے نیک عمل کی توفیق عطا فرمائی، اور جب توفیق عطا فرمائی ہے تو انشاء اللہ نوازنے کا ارادہ بھی فرمایا ہے، بس اس سے آگے مت بڑھنا، اور یہ مت سوچنا کہ مجھ سے یہ بہت بڑا عمل ہو گیا، میں نے بڑا تیر مار لیا، اور اب میں جنت کا مستحق ہو گیا ہوں، اس لئے کہ یہ سوچنا ''رؤیت عمل'' اور'' خود پسندی'' ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے، آمین۔ بہر حال! نیک عمل کا ایک نقد فائدہ تو یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے ''رجا'' اور ''امید'' بندھ جاتی ہے۔

نیک عمل کا دوسرا نقد فائدہ

نیک عمل کا دوسرا نقد فائدہ ''تعلق مع اللہ'' کا پیدا ہونا ہے، تم جو بھی نیک عمل کرو گے، وہ نیک عمل اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق میں اضافہ کرے گا، اور اللہ تعالیٰ کی محبت بڑھائے گا، اور تمام کامیابیوں کی جڑ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا مضبوط ہونا ہے۔ مثلاً آپ نے فجر کی نماز پڑھی، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم ہو گیا، پھر ظہر کی نماز پڑھی تو اب تعلق میں اضافہ ہو گیا، پھر عصر کی نماز پڑھی، پھر مغرب اور عشاء پڑھی، تو ہر مرتبہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق میں اضافہ ہو رہا ہے۔ انسانوں کا معاملہ تو یہ ہے کہ اگر ایک انسان دوسرے انسان

سے ملاقات کرے تو ایک حد تک تو ملاقات کرنے سے محبت بڑھتی ہے، اور تعلق میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن ایک حد ایسی آجاتی ہے کہ انسان زیادہ ملاقات کرنے سے زچ ہو جاتا ہے، اور یہ سوچتا ہے کہ یہ شخص تو ہر وقت سر پر کھڑا رہتا ہے، آخر کار اس کو جھڑک دے گا کہ تو نے تو مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ لہٰذا زیادہ ملنے سے بعض اوقات ملال پیدا ہو جاتا ہے، اور اکتاہٹ ہو جاتی ہے، اور آدمی زچ ہو جاتا ہے۔ اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "زُرْ غِبًّا تَزْدُدْ حُبًّا" یعنی ایک دن کے وقفے سے ملاقات کرو تو محبت میں اضافہ ہوگا۔

تم ہی اکتا جاؤ گے

لیکن اللہ جل شانہ کا معاملہ یہ ہے کہ جتنی مرتبہ ملاقات کرو گے، اتنا ہی تعلق میں اضافہ ہوگا، ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اِنَّ اللّٰہَ لَا یَمَلُّ حَتّٰی تَمَلُّوا" اللہ تعالیٰ تمہاری بار بار ملاقات کرنے سے نہیں اکتاتے، حتیٰ کہ تم خود ہی اکتا جاؤ۔ لہٰذا جتنی عبادت چاہو کرو، جتنا چاہو اللہ تعالیٰ سے تعلق بڑھاؤ، وہ تعلق بڑھتا چلا جائے گا، اس میں ملال پیدا نہیں ہوگا، لہٰذا ہر نیک عمل اللہ تعالیٰ سے تعلق میں اضافہ کا سبب ہے، اور جتنا اللہ تعالیٰ سے تعلق بڑھتا جائے گا، اتنا ہی سرور اور کیف حاصل ہوگا، اتنا ہی سکون حاصل ہوگا، اور اتنا ہی گناہوں سے بچنے کی قوت پیدا ہوگی، اتنی ہی شیطان کے حملوں سے حفاظت ہوگی۔ نفس و شیطان اس وقت حملہ آور ہوتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ سے تعلق میں کمی ہوتی ہے، ایسی صورت میں کبھی نفس بہکا دیتا ہے، اور کبھی شیطان بہکا دیتا ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہو گیا تو اب شیطان کمزور ہو جائے گا، اور وہ حملہ آور نہیں ہوگا۔ لہٰذا ہر نیک عمل کا نقد فائدہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق میں اضافہ کرتا ہے، دو نقد فائدے تو یہ ہوئے۔

نیک عمل کا تیسرا نقد فائدہ

تیسرے نقد فائدے کا حضرت والا نے یہاں ذکر نہیں فرمایا، لیکن دوسری جگہوں پر

اس کا ذکر آیا ہے، اور خود قرآن کریم نے اس فائدے کا ذکر کیا ہے، وہ یہ کہ نیک عمل انسان کے قلب کو اطمینان، سکون اور طمانیت عطا کرتا ہے۔

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ

یعنی اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ اطمینان اور سکون ایسی متاع ہے کہ لاکھوں، کروڑوں خرچ کرنے سے بھی حاصل نہیں ہوتی، کہیں بازار میں یہ نہیں ملتی۔ البتہ نیک اعمال کی یہ خاصیت ہے کہ وہ انسان کے قلب کو سکون و طمانیت عطا کرتے ہیں، اور یہ طمانیت وہ دولت ہے کہ شاید دنیا میں اس کے برابر کوئی دولت نہ ہو۔ ایک آدمی کے پاس مال و دولت ہے، کوٹھی ہے، بنگلے ہیں، نوکر چاکر ہیں، لیکن دل میں سکون و طمانیت نہیں تو اس کے لئے یہ سب دولتیں بے کار ہیں۔ لیکن ایک دوسرا شخص ہے اس کے پاس مٹی کا گھر ہے، جھونپڑی ہے، لیکن دل میں اطمینان اور سکون ہے، تو یہ دوسرا شخص پہلے والے شخص سے ہزار درجہ بہتر ہے، بہر حال اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر میں اپنی عبادت میں سکون کی خاصیت رکھی ہے، اور یہ نیک عمل کا نقد فائدہ ہے، جو اس دنیا میں حاصل ہوتا ہے۔

حضرت سفیان ثوریؒ کا مقولہ

چنانچہ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر دنیا کے بادشاہوں کو پتہ لگ جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کیسی لذت اور سکون والی زندگی عطا فرما رکھی ہے تو وہ بادشاہ تلواریں سونت کر ہم سے یہ دولت چھیننے کے لئے آجائیں کہ یہ ہمیں دو، لیکن ان بے وقوفوں کو یہ پتہ نہیں کہ یہ دولت اس طرح تلواروں کے ذریعہ حاصل نہیں ہوتی، بلکہ یہ دولت تو اللہ جل شانہ کی بارگاہ سے حاصل ہوتی ہے، اس کے ساتھ تعلق قائم کرنے سے حاصل ہوتی

ہے۔ بہر حال! یہ سکون کا حاصل ہونا نیک عمل کا نقد فائدہ ہے، جو دنیا ہی میں حاصل ہو جاتا ہے۔

نیک عمل کا چوتھا فائدہ

نیک عمل کا چوتھا فائدہ یہ ہے کہ ایک نیک عمل دوسرے نیک عمل کا ذریعہ بنتا ہے، جب تم ایک نیک عمل کرو گے تو وہ تمہیں دوسرے نیک عمل کی طرف کھینچے گا۔ گناہ کی خاصیت یہ ہے کہ ایک گناہ دوسرے گناہ کی طرف کھینچتا ہے، اسی طرح جب تم نے ایک نیک عمل کیا تو تمہیں دوسرے نیک عمل کی توفیق ہو جائے گی۔ بہر حال! نیک عمل کے یہ چار نقد فائدے ہیں، جو انسان کو دنیا ہی میں مل جاتے ہیں۔

گناہوں کا پہلا نقصان

آگے فرمایا کہ اسی طرح اعمال سیئہ کا ایک ثمرہ ادھار ہے، اور ایک نقد۔ یعنی گناہوں کا ایک نتیجہ تو ادھار ہے، جو آخرت میں ملے گا، وہ ہے عذاب جہنم، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے، آمین۔ اور گناہوں کا نقد نتیجہ وحشت، ظلمت اور بے چینی ہے، جو گناہوں کو لازم ہے، یعنی گناہوں کے اندر بے چینی اور ظلمت اللہ تعالیٰ نے رکھ دی ہے، کسی کا مذاق ہی بگڑ جائے، اور ذائقہ ہی خراب ہو جائے تو اس کو پتہ نہیں چلتا کہ یہ ظلمت ہے اور بے چینی ہے، بلکہ وہ اس کو مزیدار سمجھتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ ظلمت اور بے چینی ہے، اور اس کا نتیجہ ظاہر ہو کر رہتا ہے۔

گناہوں کی لذت کی مثال

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے گناہوں کی لذت کی ایک بہترین مثال بیان فرمائی کہ

گناہوں کی لذت ایسی ہے جیسے کسی کو خارش کی بیماری ہو تو اس کو کھجانے میں مزہ آئے گا، یہاں تک کہ لوگوں نے کہہ دیا کہ دنیا میں دو ہی چیزوں میں مزہ ہے، یا کھاج میں، یا راج میں، یعنی یا تو کھجانے میں مزہ آتا ہے، یا راج اور حکومت کرنے میں مزہ آتا ہے، کھجانے میں اتنی لذت ہے کہ اس کو حکومت کے ساتھ ملا کر ذکر کیا، اور واقعۃً جب انسان کو خارش ہو تو کھجانے میں اتنا مزہ آتا ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں، اس سے بچنا مشکل ہوتا ہے، لیکن جب کھجانا چھوڑا تو اب اس جگہ پر مرچیں لگنی شروع ہوگئیں، اور وہ بیماری اور بڑھ گئی، پھر دوبارہ کھجایا تو پھر مزہ آیا، لیکن بیماری اور بڑھ گئی، اس طرح کھجانے کے نتیجے میں بیماری بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہی معاملہ گناہوں کا ہے کہ گناہ کرنے سے لذت آتی تو ہے لیکن وہ لذت بالآخر ٹیسیں، ظلمت اور بے چینی چھوڑ جاتی ہے۔

مذاق ہی بگڑ جائے تو

ہاں! اگر کسی کا مذاق ہی بگڑ جائے تو پھر اس کو گناہ کے بعد بے چینی اور ظلمت محسوس نہیں ہوتی، جیسے اگر کسی کو بدبو کا احساس ہی ختم ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو بدبو کے اندر کھڑا ہونے میں مزہ آتا ہے، میں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ ایک جگہ پر کوڑے کا ڈھیر تھا، اور اس کوڑے میں سے شدید بدبو اٹھ رہی تھی، کہ قریب سے گزرنا مشکل تھا۔ لیکن ایک آدمی جو پاگل تھا، وہ اس کوڑے کے ڈھیر کے درمیان میں کھڑا ہے، اور ایک کتا جو ایک بوٹی اٹھا کر لے جا رہا تھا، اس شخص نے اس کتے سے وہ بوٹی چھین لی، اور اس پر فاتحانہ خوشی کا اظہار کر رہا تھا کہ میں کامیاب ہو گیا، اور فاتحانہ انداز میں قہقہے لگا رہا تھا، اس شخص کو کوئی بدبو نہیں آرہی تھی، کیوں؟ اس لئے کہ اس کی حس مٹ چکی تھی، اور اس کی حس خراب ہو گئی تھی، اس نتیجے میں یہ مردار اور یہ گندگی اس کو دولت معلوم ہو رہی تھی۔

جب تقوی کی حس مٹ جائے تو

اسی طرح جب انسان کے اندر سے ایمان کی اور تقوی کی حس مٹ جاتی ہے تو مذاق خراب ہو جاتا ہے، اور پھر آدمی گناہوں کو بھی لذت کی چیز سمجھتا ہے، اور پھر اس کو گناہوں کے اندر نہ ظلمت محسوس ہوتی ہے اور نہ وحشت محسوس ہوتی ہے، اور اللہ بچائے، یہ بڑی خطرناک بات ہے، اس لئے کہ حقیقت یہ ہے کہ گناہوں کے اندر ظلمت اور بے چینی ہے، اور وحشت ہے، لہٰذا گناہوں کا نقد نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گناہ کرنے کے بعد سکون قلب حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ ان لوگوں کو دیکھو جن کو دنیا کے اندر دولت، عزت، شہرت اور آرام کے اسباب میسر ہیں، اس کے باوجود وہ خودکشی کر رہے ہیں، کیوں خودکشی کر رہے ہیں؟ اگر پیسے نہ ہوتے اور پھر خودکشی کرتے تو ایک بات تھی، سب کچھ ہونے کے باوجود جو خودکشی کر رہے ہیں، وہ اس لئے کہ دل میں سکون میسر نہیں۔

گناہوں کا دوسرا نقد نقصان

گناہوں کا دوسرا نقد نقصان یہ ہے کہ یہ انسان کی عقل خراب کر دیتا ہے، گناہ انسان کے سامنے اچھائی کو برائی، اور برائی کو اچھائی بنا کر پیش کرتا ہے، یہ بھی ظلمت ہی کا ایک حصہ ہے، اور یہ بھی گناہ کا نقد نقصان ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں گناہوں سے بھی اور گناہوں کے نقصانات سے بھی محفوظ فرمائے، آمین۔

و آخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین